حویلی

۱

وہ آدمی ہے مگر دیکھنے کی تاب نہیں

یادش بخیر! میں نے ۱۹۴۵ء میں جب قبلہ کو پہلے پہل دیکھا تو ان کا حلیہ ایسا ہو گیا تھا جیسا اب میرا ہے۔ لیکن ذکر ہمارے یارِ طرح دار بشارت علی فاروقی کے خُسر کا ہے، لہٰذا تعارف کچھ انہی کی زبان سے اچھا معلوم ہو گا۔ ہم نے بارہا سنا، آپ بھی سنیے:

"وہ ہمیشہ سے میرے کچھ نہ کچھ لگتے تھے۔ جس زمانے میں میرے خُسر نہیں بنے تھے تو پھوپا ہوا کرتے تھے۔ اور پھوپا بننے سے پہلے میں انہیں چچا حضور کہا کرتا تھا۔ اس سے پہلے بھی یقیناً وہ کچھ اور لگتے ہوں گے، مگر اس وقت میں نے بولنا شروع نہیں کیا تھا۔ ہمارے ہاں مراد آباد اور کانپور میں رشتے ناتے اُبلی ہوئی سویّوں کی طرح اُلجھے اور پیچ در پیچ گتھے ہوتے ہیں۔ ایسا جلالی، ایسا مغلوب الغضب آدمی زندگی میں نہیں دیکھا۔ بارے ان کا انتقال ہوا تو میری عمر آدھی اِدھر، آدھی اُدھر، چالیس کے لگ بھگ تو ہو گی۔ لیکن صاحب! جیسی دہشت ان کی آنکھیں دیکھ کر چُھٹپن میں ہوتی تھی، ویسی ہی نہ صرف ان کے آخری دم تک رہی، بلکہ میرے آخری دم تک بھی رہے گی۔ بڑی بڑی آنکھیں اپنے ساکٹ سے نکلی پڑتی تھیں۔ لال سرخ۔ ایسی ویسی؟ بالکل خونِ کبوتر! لگتا تھا بڑی بڑی پتلیوں کے گرد لال ڈوروں سے ابھی خون کے فوارے چھوٹنے لگیں گے اور میرا منہ خُونم خون ہو جائے گا۔ ہر وقت غصّے میں بھرے رہتے تھے۔ جنے کیوں۔ گالی ان کا تکیہ کلام تھی۔ اور جو رنگ تقریر کا تھا وہی تحریر کا۔ رکھ ہاتھ نکلتا ہے دھواں مغزِ قلم سے۔ ظاہر ہے کچھ ایسے لوگوں سے بھی پالا پڑتا تھا جنہیں بوجوہ گالی نہیں دے سکتے تھے۔ ایسے موقعوں پر زبان سے تو کچھ نہ کہتے، لیکن چہرے پر ایسا ایکسپریشن لاتے کہ قد آدم گالی نظر آتے۔ کس کی شامت آئی تھی کہ ان کی کسی بھی رائے سے اختلاف کرتا۔ اختلاف تو درکنار، اگر کوئی شخص محض ڈر کے مارے ان کی رائے سے اتفاق کر لیتا تو فوراً اپنی رائے تبدیل کر کے اُلٹے اس کے سر ہو جاتے۔

ارے صاحب! بات اور گفتگو تو بعد کی بات ہے۔ بعض اوقات محض سلام سے مشتعل ہو جاتے تھے! آپ کچھ بھی کہیں، کیسی ہی سچی اور سامنے کی بات کہیں، وہ اس کی تردید ضرور کریں گے۔ کسی کی رائے سے اتفاق کرنے میں اپنی سبکی سمجھتے تھے۔ ان کا ہر جُملہ 'نہیں' سے شروع ہوتا تھا۔ ایک دن کانپور میں کڑاکے کی سردی پڑ رہی تھی۔ میرے منہ سے نکل گیا کہ 'آج بڑی سردی ہے' بولے 'نہیں۔ کل اس سے زیادہ پڑے گی'۔

"وہ چچا سے پھوپا بنے اور پھوپا سے خُسر الخذر، لیکن مجھے آخر وقت تک نگاہ اٹھا کر بات کرنے کی جسارت نہ ہوئی۔ نکاح کے وقت وہ قاضی کے پہلو میں بیٹھے تھے۔ قاضی نے مجھ سے پوچھا، قبول ہے؟' ان کے سامنے منہ سے ہاں کہنے کی جرات نہ ہوئی۔ بس اپنی ٹھوڑی سے دو مودّبانہ ٹھونگیں مار دیں جنہیں قاضی اور قبلہ نے رشتۂ مناکحت کے لئے ناکافی سمجھا۔ قبلہ کڑک کر بولے 'لونڈے! بولتا کیوں نہیں؟' ڈانٹ سے میں نروس ہو گیا۔ ابھی قاضی کا سوال بھی پورا نہیں ہوا تھا کہ میں نے 'جی ہاں! قبول ہے' کہہ دیا۔ آواز یکلخت اتنے زور سے نکلی کہ میں خود چونک پڑا۔ قاضی اُچھل کر سہرے میں گھس گیا۔ حاضرین کھلکھلا کے ہنسنے لگے۔ اب قبلہ اس پر بھنّا رہے ہیں کہ اتنے زور کی 'ہاں' سے بیٹی والوں کی ہیٹی ہوتی ہے۔ بس تمام عمران کا یہی حال رہا۔ اور تمام عمر میں کربِ قرابت داری و قربتِ قہری دونوں میں مبتلا رہا۔

"حالانکہ اکلوتی بیٹی، بلکہ اکلوتی اولاد تھی۔ اور بیوی کو شادی کے بڑے ارمان تھے، لیکن قبلہ نے مائیوں کے دن عین اس وقت جب میرا رنگ نکھارنے کے لئے اُبٹن مَلا جا رہا تھا، کہلا بھیجا کہ دولہا میری موجودگی میں اپنا منہ سہرے سے باہر نہیں نکالے گا۔ دو سو قدم پہلے سواری سے اتر جائے گا اور پیدل چل کر عقد گاہ تک آئے گا۔ عقد گاہ انہوں نے اس طرح کہا جیسے اپنے فیض صاحب قتل گاہ کا ذکر کرتے ہیں۔ اور سچ تو یہ ہے کہ قبلہ کی دہشت دل میں ایسی بیٹھ گئی تھی کہ مجھے تو عروسی چھپر کھٹ بھی پھانسی گھاٹ لگ رہا تھا۔ انہوں نے یہ شرط بھی لگائی کہ براتی پلاؤ زردہ ٹھونسنے کے بعد یہ ہرگز نہیں کہیں گے کہ گوشت کم ڈالا اور شکر ڈیوڑھی نہیں پڑی۔ خوب سمجھ لو، میری حویلی کے سامنے بینڈ باجا ہرگز نہیں بجے گا۔ اور تمہیں رنڈی نچوانی ہے تو، Over my dead body اپنے کوٹھے پر نچواؤ۔

"کسی زمانے میں راجپوتوں اور عربوں میں لڑکی کی پیدائش نحوست اور قہرِ الٰہی کی نشانی تصور کی جاتی تھی۔ ان کی غیرت یہ کیسے گوارہ کر سکتی تھی کہ ان کے گھر برات چڑھے۔ داماد کے

خوف سے وہ نوزائیدہ لڑکی کو زندہ گاڑ آتے تھے۔ قبلہ اس وحشیانہ رسم کے خلاف تھے۔ وہ داماد کو زندہ گاڑ دینے کے حق میں تھے۔

"چہرے، چال اور تیور سے کوتوال شہر لگتے تھے۔ کون کہہ سکتا تھا کہ بانس منڈی میں ان کی عمارتی لکڑی کی ایک معمولی سی دکان ہے۔ نکلتا ہوا قد۔ چلتے تو قد، سینہ اور آنکھیں، تینوں بیک وقت نکال کر چلتے تھے۔ ارے صاحب! کیا پوچھتے ہیں۔ اول تو ان کے چہرے کی طرف دیکھنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی، اور کبھی جی کڑا کر کے دیکھ بھی لیا تو بس لال بھبوکا آنکھیں ہی آنکھیں نظر آتی تھیں۔ نگہِ گرم سے اک آگ ٹپکتی ہے اسد۔ رنگ گندمی، آپ جیسا، جسے آپ اس گندم جیسا بتاتے ہیں جسے کھاتے ہی حضرت آدم، بیک بیوی و دو گوش جنت سے نکال دیے گئے۔ جب دیکھو جھلاتے تِنتِناتے رہتے۔ مزاج، زبان اور ہاتھ کسی پر قابو نہ تھا۔ دائمی طیش سے لرزہ براندام رہنے کے سبب اینٹ، پتھر، لاٹھی، گولی، گالی کسی کا بھی نشانہ ٹھیک نہیں لگتا تھا۔ کچھی کچھی مونچھیں جنہیں گالی دینے سے پہلے اور بعد میں تاؤ دیتے۔ آخری زمانے میں بھوؤں کو بھی بل دینے لگے۔ گٹھا ہوا کسرتی بدن ململ کے کرتے سے جھلکتا تھا۔ چُنی ہوئی آستین اور اس سے بھی مہین چُنی ہوئی دوپلّی ٹوپی۔ گرمیوں میں خس کا عطر لگاتے۔ کیکری کی سلائی کا چوڑی دار پاجامہ۔ چوڑیوں کی یہ کثرت کہ پاجامہ نظر نہیں آتا تھا۔ دھوبی الگنی پر نہیں سکھاتا تھا۔ علیحدہ بانس پر دستانے کی طرح چڑھا دیتا تھا۔ آپ رات کے دو بجے بھی دروازہ کھٹکھٹا کر بلائیں تو چوڑی دار ہی میں برآمد ہوں گے۔

واللہ! میں تو یہ تصوّر کرنے کی بھی جُرأت نہیں کر سکتا کہ دائی نے انہیں چوڑی دار کے بغیر دیکھا ہو گا۔ بھری بھری پنڈلیوں پر خوب کھبتا تھا۔ ہاتھ کے بُنے ریشمی ازاربند میں چابیوں کا گُچھا چھنچھناتا رہتا۔ جو تالے برسوں پہلے بیکار ہو گئے تھے ان کی چابیاں بھی اس گُچھے میں محفوظ تھیں۔ حد یہ کہ اس تالے کی بھی چابی تھی جو پانچ سال پہلے چوری ہو گیا تھا۔ محلے میں اس چوری کا برسوں چرچا رہا، اس لیے کہ چور صرف تالا، پہرہ دینے والا کتا اور ان کا شجرۂ نسب چُرا کر لے گیا تھا۔ فرماتے تھے کہ اتنی ذلیل چوری صرف کوئی عزیز رشتے دار ہی کر سکتا ہے۔ آخری زمانے میں یہ ازاربندی گُچھا بہت وزنی ہو گیا تھا اور موقع بے موقع فلمی گیت کے بازوبند کی طرح کھُل کھُل جاتا۔ کبھی جُھک کر گرم جوشی سے مصافحہ کرتے تو دوسرے ہاتھ سے ازاربند تھامتے۔ مئی جون میں ٹمپریچر ۱۱۰° ہو جاتا اور منہ پر لُو کے تھپیڑے پڑنے لگتے تو پاجامے سے ائیر کنڈیشننگ کر لیتے۔ مطلب یہ کہ چوڑیوں کو گھٹنوں گھٹنوں پانی میں بھگو کر، سر پر انگوچھا ڈالے، تربوز کھاتے۔ خس

خانہ و برفاب کہاں سے لاتے۔ اس کے محتاج بھی نہ تھے۔ کتنی ہی گرمی پڑے، دکان بند نہیں کرتے تھے۔ کہتے تھے، میاں! یہ تو بزنس، پیٹ کا دھندا ہے۔ جب چمڑے کی جھونپڑی (پیٹ) میں آگ لگ رہی ہو تو کیا گرمی کیا سردی۔ لیکن ایسے میں کوئی شامت کا مارا گاہک آ نکلے تو برا بھلا کہہ کے بھگا دیتے تھے۔ اس کے باوجود وہ کھچا کھچا دوبارہ انہی کے پاس آتا تھا۔ اس لئے کہ جیسی عمدہ لکڑی وہ بیچتے تھے، ویسی سارے کانپور میں کہیں نہیں ملتی تھی۔ فرماتے تھے، داغی لکڑی بندے نے آج تک نہیں بیچی۔ لکڑی اور داغ دار؟ داغ تو دو ہی چیزوں پر سجتا ہے۔ دل اور جوانی۔

لفظ کے لچھن اور بازاری پان

"تمباکو، قوام، خربوزے اور کڑھے ہوئے کُرتے لکھنؤ سے، حقہ مراد آباد اور تالے علی گڑھ سے منگواتے تھے۔ حلوہ سوہن اور ڈپٹی نذیر احمد والے محاورے دلّی سے۔ دانت گرنے کے بعد صرف محاوروں پر گزارہ تھا۔ گالیاں البتہ مقامی بلکہ خانہ ساز دیتے جن میں سلاست و روانی پائی جاتی تھی۔ طبع زاد لیکن بلاغت سے خالی۔ بس جغرافیہ سا کھینچ دیتے تھے۔ سلیم شاہی جوتیاں اور چُنری آپ کے جے پور سے منگواتے تھے۔ صاحب! آپ کا راجستھان بھی خوب تھا۔ کیا کیا سوغاتیں گنوائی تھیں اس دن آپ نے؟ ——— کھانڈ، سانڈ، بھانڈ اور رانڈ۔ اور یہ بھی خوب رہی کہ مارواڑیوں کو جس چیز پر بھی پیار آتا ہے اس کے نام میں ٹھ، ڈ اور ڑ لگا دیتے ہیں۔ مگر یہ بات آپ نے عجیب بتائی کہ راجستھان میں رانڈ سے مراد خوبصورت عورت ہوتی ہے۔ مارواڑی زبان میں سچ مچ کی بیوہ کے لئے بھی کوئی لفظ ہے کہ نہیں؟ یا سبھی خوبصورت نورؑ علیٰ نور بلکہ حورؑ علیٰ حور ہوتی ہیں۔ لیکن یہ بھی درست ہے کہ سو سوا سو سال قبل تک رنڈی سے بھی مراد صرف عورت ہوتی تھی۔ جب سے مردوں کی نیتیں خراب ہوئیں، اس لفظ کے لچھن بھی بگڑ گئے۔ صاحب! راجستھان کے تین طُرفہ تحفوں کے تو ہم بھی قائل اور گھائل ہیں۔ میرا بائی، مہدی حسن اور ریشماں۔

"ہاں، تو میں کہہ یہ رہا تھا کہ باہر نکلتے تو ہاتھ میں پان کی ڈبیا اور بٹوہ رہتا۔ بازار کا پان ہرگز نہیں کھاتے تھے۔ کہتے تھے، بازاری پان صرف رنڈوے، تماشبین اور بمبئی والے کھاتے ہیں۔ صاحب، یہ نفاست اور پرہیز میں نے انہی سے سیکھا۔ ڈبیا چاندی کی۔ نقشین۔ بھاری۔ ٹھوس۔ اس میں جگہ جگہ ڈینٹ نظر آتے تھے جو انسانی سروں سے تصادم کے باعث پڑے

تھے۔ طیش میں اکثر پانوں بھری ڈبیا پھینک مارتے۔ بڑی دیر تک تو یہ پتہ ہی نہیں چلتا تھا کہ مضروب کے سر اور چہرے سے خون نکل رہا ہے یا بکھرے پانوں کی لالی نے غلط جگہ رنگ جمایا ہے۔ بٹوے خاص طور سے آپ کی جائے پیدائش، ریاست ٹونک سے منگواتے تھے۔ کہتے تھے کہ وہاں کے پٹوے ایسے ڈورے ڈالتے ہیں کہ اک ذرا گھنڈی کو جھوٹوں ہاتھ لگادو تو بٹوہ آپی آپ مصاحبوں کی باچھوں کی طرح کھلتا چلا جاتا ہے۔ گٹکا بھوپال سے آتا تھا۔ لیکن خود نہیں کھاتے تھے۔ فرماتے تھے، میٹھا پان، ٹھمری، گٹکا اور ناول۔ یہ سب نابالغوں کے شغل ہیں۔ شاعری سے کوئی خاص دلچسپی نہ تھی۔ ردیف قافیے سے آزاد شاعری سے بطور خاص چڑتے تھے۔ یوں بھی، بقول شخصے، آزاد شاعری کی مثال ایسی ہے جیسے بغیر نیٹ کے ٹینس کھیلنا۔ لیکن اتنا ضرور تھا کہ اردو فارسی کے جتنے بھی اشعار لکڑی، آگ، دھوئیں، ہیکڑی، لڑ مرنے، ناکامی اور خواری سے متعلق ہیں سب یاد کر رکھے تھے۔ صورت حال کبھی قابو سے باہر ہو جاتی تو شعر سے اس کا دفعیہ فرماتے۔ آخری زمانے میں عزلت گزیں اور مردم بیزار ہو گئے تھے اور صرف دشمنوں کے جنازے کو کندھا دینے کے لئے باہر نکلتے تھے۔ خود کو کاسنی اور بیوی کو موتیا رنگ پسند تھا۔ شیروانی ہمیشہ موتیا رنگ کے ٹسر کی پہنی"۔

واہ کیا بات کورے برتن کی!

بشارت کی زبانی تعارف ختم ہوا۔ اب کچھ میری، کچھ ان کی زبانی سنیے اور رہی سہی، زبانِ خلق سے، جسے کوئی نہیں پکڑ سکتا۔

کانپور میں پہلے بانس منڈی اور پھر کوپر گنج میں قبلہ کی عمارتی لکڑی کی دکان تھی۔ اسی کو آپ ان کا حیلہ معاش اور وسیلۂ مردم آزاری کہہ سکتے ہیں۔ تھوڑی بہت جلانے کی لکڑی بھی رکھتے تھے مگر اسے کبھی لکڑی نہیں کہا۔ سوختہ یا ہیزم سوختنی کہتے تھے۔ ان کی دکان کو کبھی کوئی ناآشنائے مزاج ٹال کہہ دیتا تو دوسیری لے کر دوڑتے۔ جوانی میں پنسیری لے کر دوڑتے تھے۔ تمام عمر پتھر کے باٹ استعمال کئے۔ فرماتے تھے، لوہے کے فرنگی باٹ بھاری اور بے برکت ہوتے ہیں۔ پتھر کے باٹ کو بازوؤں میں بھر کے، سینے سے لگا کے اٹھانا پڑتا ہے۔ اعمال تو دور رہے، کبھی کسی کو یہ جرات نہ ہوئی کہ ان کے پتھر کے باٹوں ہی کو تلوا کر دیکھ لے۔ کس کی شامت آئی تھی کہ ان کی دی ہوئی رقم یا لوٹائی ہوئی ریزگاری کو گن کر دیکھے۔ اس زمانے میں، یعنی اس صدی کی تیسری دہائی میں عمارتی لکڑی کی کھپت بہت کم تھی۔ 'سال' اور چیڑ کا رواج عام تھا۔

بہت ہوا تو چوکھٹ اور دروازے شیشم کے بنوا لئے۔ ساگوان تو صرف امراء رُؤسا کی ڈائننگ ٹیبل اور گوروں کے تابوت میں استعمال ہوتی تھی۔ فرنیچر ہوتا ہی کہاں تھا۔ بھلے گھروں میں فرنیچر کے ذیل میں صرف چارپائی آتی تھی۔ جہاں تک ہمیں یاد پڑتا ہے، ان دنوں کرسی صرف دو موقعوں پر نکالی جاتی تھی۔ اوّل، جب حکیم، وید، ہومیوپیتھ، پیر، فقیر اور سیانوں سے مایوس ہو کر ڈاکٹر کو گھر بلایا جائے۔ اس پر بیٹھ کر وہ جگہ جگہ اسٹے تھس کوپ لگا کر دیکھتا کہ مریض اور موت کے درمیان جو خلیج حائل تھی اسے ان حضرات نے اپنی دواؤں اور تعویذ گنڈوں سے کس حد تک پُر کیا ہے۔ اس زمانے کا دستور تھا کہ جس گھر میں موسمبی یا مہین لکڑی کی پٹاری میں روئی میں رکھے ہوئے پانچ انگور آئیں، یا سولاہیٹ پہنے ڈاکٹر آئے (اور اس کے آگے آگے ہٹو بچو کرتا ہوا تیماردارِ خصوصی اس کا چمڑے کا بیگ اٹھائے) تو اڑوس پڑوس والے جلدی جلدی کھانا کھا کر خود کو تعزیت اور کندھا دینے کے لئے تیار کر لیتے تھے۔ درحقیقت ڈاکٹر کو صرف اس مرحلے پر بلا کر اس کرسی پر بٹھایا جاتا تھا جب وہ صورتِ حال پیدا ہو جائے جس میں دو ہزار سال پہلے لوگ حضرت عیسیٰ کو آزماتے تھے۔ کرسی کے استعمال کا دوسرا اور آخری موقع ہمارے یہاں ختنوں پر آتا تھا جب لڑکے کو دولہا کی طرح سجا بنا اور مٹی کا کھلونا ہاتھ میں دے کر اس کرسی پر بٹھا دیا جاتا تھا۔ اس جلادی کرسی کو دیکھ کر اچھے اچھوں کی گھگھی بندھ جاتی تھی۔ غریبوں میں اس مقصد کے لئے نئے ماٹ یا لمبی وضع کے کورے مٹکے * کو الٹا کر کے سرخ کپڑا ڈال دیتے تھے۔

---

* کورے مٹکے کا ذکر آیا تو نوکِ قلم پر بے اختیار نظیر اکبر آبادی کا شعر آ رہا ہے جسے نقل کئے بغیر رہا نہیں جاتا:

تازگی دل کی اور تری تن کی
واہ کیا بات کورے برتن کی

نظیر اکبر آبادی کی کیا بات ہے۔ کوئی سی نظم اٹھا کر دیکھ لیجئے۔ انہیں جہاں کہیں قدرت کی کاریگری یا خدا کی شان نظر آ جاتی ہے، وہیں پائے بُتاں پہ سر بسجود ہو کر ثنائے سراپا میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ پنہاری کے سر پر کورا مٹکا دیکھا تو ردیف قافیے کی کانی اوٹ لے کر سارے سراپا کو نظروں سے کھوند ڈالا۔ پھر تو "اس کا جوبن کچھ اور ہی مٹکا" اس میں وہ اپنے دل اور قافیے کے ہاتھوں مجبور ہیں۔ جہاں جہاں وہ لے جائیں، چاؤ سے جاتے ہیں۔ حد یہ کہ گھڑونچی اور لوٹا دیکھ کر صبر و قرار و قافیہ ہاتھ سے چھوٹا جاتا ہے۔ دل میں خیالات فاسد پیدا ہونے لگتے ہیں۔

کوری ٹھلیا پہ دیکھ کر لوٹا
دل لگا ہونے کچھ کھرا کھوٹا

اس میں بچارے (ٹونٹی دار؟) لوٹے کا بظاہر صرف اتنا قصور معلوم ہوتا ہے کہ وہ ان کے معشوق سے مشابہت رکھتا ہے۔

چارپائی

سچ تو یہ ہے کہ جہاں چارپائی ہو وہاں کسی فرنیچر کی ضرورت، نہ گنجائش، نہ تُک۔ انگلستان کا موسم اگر اتنا ذلیل نہ ہوتا اور انگریزوں نے بروقت چارپائی ایجاد کر لی ہوتی تو نہ صرف یہ کہ وہ موجودہ فرنیچر کی کھکھیڑ سے بچ جاتے، بلکہ پھر آرام دہ چارپائی چھوڑ کر، کالونیز بنانے کی خاطر، گھر سے باہر نکلنے کو بھی ان کا دل نہ چاہتا۔ "اوور ورکڈ" سورج بھی ان کی سلطنت پر ایک صدی تک ہمہ وقت چمکتے رہنے کی ڈیوٹی سے بچ جاتا۔ اور کم از کم آج کل کے حالات میں اٹواٹی کھٹواٹی لے کر پڑ رہنے کے لئے ان کے گھر میں کوئی ڈھنگ کی چیز تو ہوتی۔ ہم نے ایک دن پروفیسر قاضی عبدالقدوس ایم اے، بی ٹی سے کہا کہ بقول آپ کے، انگریز تمام ایجادات کے موجد ہیں۔ آسائش پسند، بے حد پریکٹیکل لوگ ہیں۔ حیرت ہے چارپائی استعمال نہیں کرتے! بولے، ادوان کسنے سے جان چُراتے ہیں! راقم الحروف کے خیال میں، ایک بنیادی فرق ذہن میں ضرور رکھنا چاہیے۔ وہ یہ کہ یورپین فرنیچر صرف بیٹھنے کے لئے ہوتا ہے، جب کہ ہم کسی ایسی چیز پر بیٹھتے ہی نہیں جس پر لیٹ نہ سکیں۔ مثال میں دری، گدیلے، قالین، جازم، چاندنی، چارپائی، کوچۂ یار اور پہلوئے دلدار کو پیش کیا جا سکتا ہے۔ ایک چیز ہمارے ہاں البتہ ایسی تھی جسے صرف بیٹھنے کے لئے استعمال کیا جاتا تھا۔ اسے حکمرانوں کا تخت کہتے تھے۔ لیکن جب انہیں اسی پر لٹکا کر اور پھر لٹا کر نہلا دیا جاتا تو یہ تختہ کہلاتا تھا اور اس عمل کو تختہ الٹنا کہتے تھے۔

اسٹیشن، لکڑ منڈی اور بازارِ حسن میں بجوگ

مقصد اس تمہیدِ غیر دل پذیر کا یہ کہ جہاں چارپائی کا چلن ہو وہاں فرنیچر کی بزنس پنپ نہیں سکتی۔ اب اسے چوب عمارتی کہئے یا ہیزم غیر سوختنی، دھندا اس کا بھی ہمیشہ مندا ہی رہتا تھا کہ دکانوں کی تعداد گاہکوں سے زیادہ تھی۔ لہٰذا کوئی شخص ایسا نظر آ جائے جو حُلیے اور چال ڈھال سے ذرا بھی گاہک معلوم ہو تو لکڑ منڈی کے دو کاندار اس پر ٹوٹ پڑتے۔ بیشتر گاہک گرد و نواح کے دیہاتی ہوتے جو زندگی میں پہلی اور آخری بار لکڑی خریدنے کانپور آتے تھے۔ ان بچاروں کا لکڑی سے دو ہی مرتبہ سابقہ پڑتا تھا۔ ایک، اپنا گھر بناتے وقت۔ دوسرے، اپنا کریا کرم کرواتے سمے۔ قیام پاکستان سے پہلے جن پڑھنے والوں نے دلّی یا لاہور کے ریلوے اسٹیشن کا نقشہ دیکھا ہے، وہ اس چھینا جھپٹی کا بخوبی اندازہ کر سکتے ہیں۔ ۱۹۴۵ میں ہم نے دیکھا کہ دلّی سے لاہور آنے والی ٹرین کے رُکتے ہی جیسے ہی مسافر نے اپنے جسم کا کوئی حصہ دروازے یا کھڑکی سے باہر نکالا، قلی

نے اسی کو مضبوطی سے پکڑ کے سالم مسافر کو ہتھیلی پر رکھا اور ہوا میں اُدھر اٹھا لیا۔ اور اٹھا کر پلیٹ فارم پر کسی صراحی یا حقّے کی چلم پر بٹھا دیا۔ لیکن جو مسافر دوسرے مسافروں کے دھکّے سے خود بخود ڈبّے سے باہر نکل پڑے، ان کا حشر ویسا ہی ہوا جیسا اردو کی کسی نئی نویلی کتاب کا نقّادوں کے ہاتھ ہوتا ہے۔ جو چیز جتنی بھی جس کے ہاتھ لگی، سر پر رکھ کر ہوا ہو گیا۔ دوسرے مرحلے میں مسافر پر ہوٹلوں کے دلال اور ایجنٹ ٹوٹ پڑتے۔ سفید ڈرل کا کوٹ پتلون، سفید قمیص، سفید رومال، سفید کینوس کے جوتے، سفید موزے، سفید دانت۔ اس کے باوجود محمد حسین آزاد کے الفاظ میں ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ چنبیلی کا ڈھیر پڑا ہنس رہا ہے۔ ان کی ہر چیز سفید اور اجلی ہوتی، سوائے چہرے کے۔ ہنستے تو معلوم ہوتا تو ہنس رہا ہے۔ یہ مسافر پر اس طرح گرتے جیسے انگلستان میں رگبی کی گیند اور ایک دوسرے پر کھلاڑی گرتے ہیں۔ ان کی ساری تگ و دو کا مقصد خود کچھ حاصل کرنا نہیں، بلکہ دوسروں کو حاصل کرنے سے باز رکھنا ہوتا تھا۔ مسلمان دلال ترکی ٹوپی سے پہچانے جاتے۔ وہ دلّی اور یوپی سے آنے والے مسلمان مسافروں کو ٹونٹی دار لوٹے، مستورات، کثرتِ اطفال اور قیمے پراٹھے کے بھبکے سے فوراً پہچان لیتے اور "اسلام علیکم Brother in Islam" کہہ کر لپٹ جاتے۔ مسلمان مسافروں کے ساتھ صرف مسلمان دلال ہی دھینگا مشتی کر سکتے تھے۔ جس دلال کا ہاتھ مسافر کے کپڑوں کے مضبوط ترین حصے پر پڑتا وہی اسے گھسیٹتا ہوا باہر لے آتا۔ جن کا ہاتھ لباس کے کمزور یا بوسیدہ حصوں پر پڑتا، وہ بعد میں ان کو بطور دستی رومال استعمال کرتے۔ نیم ملبوس مسافر قدم قدم پر اپنی ستر کشائی کرواتا، اسٹیشن کے باہر قدم رکھتا تو لاتعداد پہلوان جنہوں نے اکھاڑے کو ناکافی محسوس کر کے تانگہ چلانے کا پیشہ اختیار کر لیا تھا خود کو اس پر چھوڑ دیتے۔ اگر مسافر کے تن پر کوئی چیتھڑا اتفاقاً بچ رہا تو اسے بھی نوچ کر تانگے کی پچھلی سیٹ پر رامچندر جی کی کھڑاؤں کی طرح سجا دیتے۔ اگر کسی کے چوڑی دار کے کمر بند کا سرا تانگے والے کے ہاتھ لگ جاتا تو وہ غریب گرہ پہ ہاتھ رکھے اسی میں بندھا چلا آتا۔ کوئی مسافر کا دامن آگے سے کھینچتا، کوئی پیچھے سے زُلیخائی کرتا۔ آخری راؤنڈ میں ایک تگڑا سا تانگے والا سواری کا دایاں ہاتھ اور دوسرا مسٹنڈا اس کا بایاں ہاتھ پکڑ کے tug of war کھیلنے لگتے۔ لیکن قبل اس کے کہ ہر دو فریقین اپنے اپنے حصے کی ران اور دست اکھیڑ کر لے جائیں، ایک تیسرا پھرتیلا تانگے والا ٹانگوں کے چِرے ہوئے چمٹے کے نیچے بیٹھ کر مسافر کو یکلخت اپنے کندھوں پر اٹھا لیتا اور تانگے میں جوت کر ہوا ہو جاتا۔

کم و بیش یہی نقشہ کوپر گنج کی لکڑ منڈی کا ہوا کرتا تھا، جس کے قلب میں قبلہ کی دکان

تھی۔ گودام بالعموم دکان سے ملحق، عقب میں ہوتے تھے۔ گاہک پکڑنے کے لئے قبلہ اور دو تین چڑیمار دکانداروں نے یہ کیا کہ دکانوں کے باہر سڑک پر لکڑی کے چھوٹے چھوٹے کیبن بنا لیے۔ قبلہ کا کیبن مسند تکیے، حقّے، اگالدان اور اسپرنگ سے کھلنے والے چاقو سے آراستہ تھا۔ کیبن گویا ایک نوع کا مچان تھا جہاں سے گاہک کو مار گراتے تھے۔ پھر اسے چمکار پچکار کر اندر لے جایا جاتا جہاں کوشش یہ ہوتی تھی کہ خالی ہاتھ اور بھری جیب واپس نہ جانے پائے۔ جیسے ہی کوئی شخص جو قیافے سے گاہک لگتا، سامنے سے گزرتا تو دور و نزدیک کے دکاندار اسے ہاتھ کے اشارے سے یا آواز دے کر بلاتے "مہاراج! مہاراج!" ان مہاراجوں کو دوسرے دکانداروں کے پنجے سے چھڑانے اور خود گھسیٹ کر اپنے کچھار میں لے جانے کے دوران اکثر ان کی پگڑیاں کھل کر پیروں میں الجھ جاتیں۔ اس سلسلے میں آپس میں اتنے جھگڑے اور ہاتھا پائی ہو چکی تھی کہ منڈی کے تمام بیوپاریوں نے پنچایتی فیصلہ کیا کہ گاہک کو صرف وہی دکاندار آواز دے کر بلائے گا جس کی دکان کے سامنے سے وہ گزر رہا ہو۔ لیکن جیسے ہی وہ کسی دوسرے دکاندار کے حلقۂ تشدد میں داخل ہو گا تو اسے کوئی اور دکاندار ہرگز آواز نہ دے گا۔ اس کے باوجود چھینا جھپٹی اور کشتم پچھاڑ بڑھتی ہی گئی تو ہر دکان کے آگے چُونے سے حد بندی کی لائن کھینچ دی گئی۔ اس سے یہ فرق پڑا کہ کشتی بند ہو گئی۔ کبڈی ہونے لگی۔ بعض دکانداروں نے مار پیٹ، گاہکوں کا ہانکا کرنے اور انہیں ڈنڈا ڈولی کر کے اندر لانے کے لئے بگڑے پہلوان اور شہر کے چھٹے ہوئے شُہدے اور مسٹنڈے پارٹ ٹائم ملازم رکھ لئے تھے۔ کساد بازاری اپنی انتہا کو پہنچی ہوئی تھی۔ یہ لوگ دن میں لکڑ منڈی میں گاہکوں کو ڈرا دھمکا کر ناقص اور کنڈم مال خریدواتے اور رات کو یہی فریضہ بازارِ حسن میں انجام دیتے۔ بہت سی طوائفوں نے اپنی آبرو کو ہر شب زیادہ سے زیادہ غیر محفوظ رکھنے کی غرض سے ان کو بطور "پِمپ" ملازم رکھ چھوڑا تھا۔ قبلہ نے اس قسم کا کوئی غنڈا یا بدکردار پہلوان ملازم نہیں رکھا کہ انہیں اپنے زور بازو پر پورا بھروسا تھا۔ لیکن اوروں کی طرح مال کی چِرائی کٹائی میں مار کُٹائی کا خرچہ بھی شامل کر لیتے تھے۔

آلات اخراج خون: جونک، سینگی، لاٹھی

ہمہ وقت طیش کا عالم طاری رہتا تھا۔ سونے سے پہلے ایسا موڈ بنا کر لیٹتے کہ آنکھ کُھلتے ہی غصہ کرنے میں آسانی ہو۔ پیشانی کے تین بل سوتے میں بھی نہیں مٹتے تھے۔ غصے کی سب سے خالص قسم وہ ہوتی ہے جو کسی اشتعال کی محتاج نہ ہو یا کسی بہت ہی معمولی سی بات پر آجائے۔ غصے کے آخر ہوتے ہوتے یہ بھی یاد نہیں رہتا تھا کہ آیا کس بات پر تھا۔ بیوی ان کو روزہ نہیں

رکھنے دیتی تھیں۔ غالباً ۱۹۳۵ء کا واقعہ ہے۔ ایک دن عشا کی نماز کے بعد گڑگڑا گڑگڑا کر اپنی دیرینہ پریشانیاں دور ہونے کی دعائیں مانگ رہے تھے کہ ایک تازہ پریشانی کا خیال آتے ہی ایک دم جلال آگیا۔ دعا ہی میں کہنے لگے کہ تو نے میری پرانی پریشانیاں ہی کون سے رفع کر دیں جواب یہ نئی پریشانی دور کرے گا۔ اس رات مُصلّا تہ کرنے کے بعد پھر کبھی نماز نہیں پڑھی۔

ان کے غصّے پر یاد آیا کہ اس زمانے میں کن میلئے محلّوں بازاروں میں پھیری لگاتے تھے ۔ کان کا میل نکالنے پر ہی کیا موقوف، دنیا جہان کے کام گھر بیٹھے ہو جاتے تھے ۔ سبزی، گوشت اور سودا سلف کی خریداری، حجامت، تعلیم، زچگی، پیڑھی، کھاٹ کھٹولے کی ——— یہاں تک کہ خود اپنی مرمّت بھی سب گھر بیٹھے ہو جاتی۔ بیبیوں کے ناخن نہرنی سے کاٹنے اور پیٹھ ملنے کے لئے نائینیں گھر آتی تھیں۔ کپڑے بھی مغلانیاں گھر آکر سیتی تھیں تاکہ نامحرموں کو ناپ تک کی ہوا نہ لگے۔ حالانکہ اس زمانے کی زنانہ پوشاک کے جو نمونے ہماری نظر سے گزرے ہیں وہ ایسے ہوتے تھے کہ کسی بھی لیٹر بکس کا ناپ لے کر سئے جا سکتے تھے۔ غرض کہ سب کام گھر ہی میں ہو جاتے۔ حد یہ کہ موت تک گھر میں واقع ہوتی تھی۔ اس کے لئے باہر جا کر کسی ٹرک سے اپنی روح قبض کروانے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ فسادِ خون سے کسی کے بار بار پھوڑے پُھنسی نکلیں، یا دماغ میں خیالات فاسدہ کا ہجوم دن دہاڑے بھی رہنے لگے تو گھر پر ہی فصد کھول دی جاتی تھی۔ فاضل و فاسد خون نکلوانے کی غرض سے اپنا سر پھڑوانے یا پھوڑنے کے لئے کسی سیاسی جلسے میں جانے یا حکومت کے خلاف مظاہرہ کر کے لاٹھی کھانے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ اس زمانے میں لاٹھی کو آلۂ اخراجِ خون کے طور پر استعمال نہیں کیا جاتا تھا۔ جونک اور سینگی * لگانے والی کنجریاں روز پھیری لگاتی تھیں۔ اگر اس زمانے کے کسی حکیم کا ہاتھ آج کل کے نوجوانوں کی نبض پر پڑ جائے تو کوئی نوجوان ایسا نہ بچے جس کے جہاں تہاں سینگی لگی نظر نہ آئے۔ رہے ہم جیسے آج کل کے بزرگ کہ

کی جس سے بات اس کو ہدایت ضرور کی

تو کوئی بزرگ ایسا نہ بچے گا جس کی زبان پر حکیم صاحبان جونک نہ لگوا دیں۔

---

* سینگی: درد یا فسادِ خون کے مقام پر ہلکا سا شگاف لگایا جاتا تھا۔ پھر سوراخ کئے ہوئے سینگ کے بڑے دہانے کو اس پر رکھ کر اور سوراخ والے سرے کو منہ سے لگا کر سارا فاسد و غیر فاسد خون کھینچ لیا جاتا تھا۔ اس عمل کو یونانی طب کی اصطلاح میں سینگی لگانا اور اردو شاعری میں قافیہ کہتے ہیں۔

ہم واقعہ یہ بیان کرنے چلے تھے کہ گرمیوں کے دن تھے۔ قبلہ ادلے کا قورمہ اور خربوزہ تناول فرما کر کیبن میں قیلولہ کر رہے تھے کہ اچانک کن میلئے نے کیبن کے دروازے پر بڑے زور سے آواز لگائی "کان کا میل"۔ خدا جانے میٹھی نیند سو رہے تھے یا کوئی بہت ہی حسین خواب دیکھ رہے تھے جس میں گاہک ان سے تگنے داموں دھڑا دھڑ لکڑی خرید رہے تھے، ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے۔ ایک دفعہ تو دہل گئے۔ چق کے پاس پڑی ہوئی لکڑی اٹھا کر اس کے پیچھے ہو لئے۔ کمینے کی یہ جراءت کہ ان کے کان سے فقط ایک گز دور بلکہ پاس ایسے گستاخانہ طریقے سے چیخے۔ یہ کہنا تو درست نہ ہو گا کہ آگے آگے وہ اور پیچھے پیچھے یہ۔ اس لئے کہ قبلہ غصے میں ایسے بھرے ہوئے تھے کہ کبھی کبھی اس سے آگے بھی نکل جاتے۔ سڑک پر کچھ دور بھاگنے کے بعد کن میلیا گلیوں میں نکل گیا اور آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔ مگر قبلہ محض اپنی چھٹی حس کی بتائی ہوئی سمت میں دوڑتے رہے اور یہ وہ سمت تھی جس طرف کوئی شخص جس کے پانچوں حواس سلامت ہوں، جارحانہ انداز میں لکڑی لاٹھی گھماتا ہرگز نہ جاتا کہ یہ تھانے کی طرف جاتی تھی۔ اس وحشیانہ دوڑ میں قبلہ کی لکڑی اور کن میلئے کا پگڑ جس کے ہر پیچ میں اس نے میل نکالنے کے اوزار اُڑس رکھے تھے، زمین پر گر گیا۔ اس میں سے ایک ڈبیا بھی نکلی جس میں اس نے کان کا میل جمع کر رکھا تھا۔ نظر بچا کر اسی میں سے تولہ بھر میل نکال کر دکھا دیتا کہ دیکھو، یہ تمہارے کان سے نکلا ہے۔ کسی کے کان سے گولر کے بھُنگے برآمد کر کے کہتا کہ تمہارے کان میں جو بھن بھن تن تن کی آوازیں آ رہی تھیں وہ انہیں کی تھیں۔ لیکن یہ سچ ہے کہ وہ کان کی بھول بھلیوں میں اتنی دور تک سہج سہج سلائی ڈالتا چلا جاتا کہ محسوس ہوتا ابھی کان کے راستے آنتیں بھی نکال کر ہتھیلی پر رکھ دے گا۔ قبلہ نے اس پگڑ کو بلّی پر چڑھا کر بلّی اپنی کیبن کے سامنے اس طرح گاڑ دی جس طرح اگلے وقتوں میں کوئی بے صبرا ولی عہد، یا وہ نہ ہو تو پھر کوئی دشمن، بادشاہ سلامت کا سر کاٹ کر نیزے پر ہر خاص و عام کی اطلاع کے لئے بلند کر دیتا تھا۔ اس کی دہشت ایسی بیٹھی کہ دکان کے سامنے سے بڑھئی، کھٹ بُنے، سینگی لگانے والیوں اور سحری کے لئے جگانے والوں نے بھی نکلنا چھوڑ دیا۔ ملحقہ مسجد کا کریہہ الصوت مؤذن بھی عقب والی گلی سے آنے جانے لگا۔

کانسی کی لُٹیا، بالی عُمریا اور چگّی داڑھی

قبلہ اپنا مال بڑی توجہ، محنت اور محبت سے دکھاتے تھے۔ 'محبت' کا اضافہ ہم نے اس لئے کیا کہ وہ گاہک کو تو شیر کی نظر سے دیکھتے، مگر اپنی لکڑی پر محبت سے ہاتھ پھیرتے رہتے۔ کوئی ساگوان کا تختہ ایسا نہیں تھا جس کے ریشوں کے ابر اور رگوں (Veins) کا طغریٰ، اگر وہ چاہیں

تو، یادداشت سے کاغذ پر نہ بنا سکتے ہوں۔ لکڑمنڈی میں وہ واحد دکاندار تھے جو گاہک کو اپنا اور ہر شہتیر اور بلّی کا شجرۂ نسب ازبر کرا دیتے تھے۔ ان کا اپنا شجرۂ نسب بلّی سے بھی زیادہ لمبا تھا۔ اس پر اپنے جدّاعلیٰ کو ٹانگ رکھا تھا۔ ایک بلّی کی قامتِ زیبا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے، سوا اُنتالیس فٹ لمبی ہے! گونڈہ کی ہے۔ افسوس! اصغر گونڈوی کے غوغائے شاعری نے گونڈہ کی بلّیوں کی شہرت کا بیڑا غرق کر دیا۔ لاکھ کہو، اب کسی کو یقین ہی نہیں آتا کہ گونڈے کی اصل وجہ شہرت خوبصورت بلّیاں تھیں۔ اصغر گونڈوی سے پہلے ایسی سیدھی، بے گانٹھ بلّی ملتی تھی کہ چالیس فٹ اونچے سرے پر سے چھلّا چھوڑو تو بے روک، سیدھا نیچے جھن سے آ کے ٹھہرتا تھا۔ ان کے ہاں کا ہر شہتیر اصیل اور خاندانی تھا۔ بیشتر تو خالص مغل یا روہیل کھنڈ کے پٹھان معلوم ہوتے تھے کہ ہر آئے گئے کے کپڑے پھاڑتے اور خود مشکل سے چرتے تھے۔ کبھی قبلہ کونے میں پڑے ہوئے گرم و سرد و سیلاب چشیدہ seasoned تختے کی طرف اتنے ادب و احترام سے اشارہ کرتے گویا ابھی ابھی جودی پہاڑ کی ترائی سے کشتیِ نوح میں سے اکھاڑ کر بطور خاص ایک "دانہ" آپ کے approval کے لیے لے آئے ہیں۔ کبھی برمی ساگوان کے لٹھے پر شفقت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہتے، میاں! ابھی اس کی عمر ہی کیا ہے! بچّہ ہے۔ بہت سے بہت اسّی سال۔ ڈیڑھ ڈیڑھ سو سال کا ساگوان اراودی کے جنگلوں میں آندھی طوفان میں بالکل کھڑی کمر استادہ رہتا ہے۔ لیکن صاحب! ہے بلا کا سیزنڈ۔ سیکڑوں بارشوں اور سات دریاؤں کا پانی پی کے یہاں پہنچا ہے۔ اور اس لٹھے پر تو مگرمچھ نے پیشاب بھی کیا ہے۔ (انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے) یہ جو کنول نین گرہ نظر آ رہی ہے، اس پر۔ مگرمچھ جس لکڑی پہ مُوت دے اس کو حشر تک نہ دیمک لگ سکتی ہے، نہ آگ! اس پر خواجہ عبدالمجید جو منشیانہ ڈیسک کے لئے لکڑی خریدنے آئے تھے، پوچھ بیٹھے "کیا مگرمچھ بجلی کے کھمبے کے بجائے درخت پر....." وہ جملہ مکمل نہ کر پائے تھے کہ قبلہ تنک کر بولے "جی نہیں! مگرمچھ تو سبیل اہل اسلام میں زنجیر سے بندھے ہوئے ٹین کے گلاس سے پانی پی کے، سڑک پر ٹہل ٹہل کے استنجا سُکھاتے ہیں۔ آپ کے والد ماجد کی طرح۔ آیا خیال شریف میں؟

بس چوبیس گھنٹے مزاج کی کچھ ایسی ہی جوالا مُکھی کیفیت رہتی تھی۔ ایک دفعہ حاجی محمد اسحاق چمڑے والے کچھ شیشم خریدنے آئے۔ قبلہ یوں تو ہر لکڑی کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملا دیتے تھے، لیکن شیشم پر سچ مچ فریفتہ تھے۔ اکثر فرماتے "تختِ طاؤس میں شاہ جہاں نے شیشم ہی لگوائی تھی۔ شیشم کے گُن گاہک اور قدردان تو قبر میں جا سوئے۔ مگر کیا بات

ہے شیشم کی! جتنا استعمال کرواتے ہی جوہر کھلتے ہیں۔ شیشم کی جس چارپائی پر میں پیدا ہوا، اسی پر دادا میاں کی ولادت ہوئی تھی"۔ اپنے حسنِ تولد و توارد کو قبلہ چارپائی اور دادا جان دونوں کے لئے باعث سعادت و افتخار سمجھتے تھے۔ حاجی محمد اسحاق بولے "یہ لکڑی تو صاف معلوم نہیں ہوتی"۔ قبلہ نہ جانے کتنے برسوں بعد مسکرائے۔ حاجی صاحب کی داڑھی کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھتے ہوئے ارشاد فرمایا "یہ بات ہم نے شیشم کی لکڑی، کانسی کی لُٹیا، بالی عُمریا اور چگّی داڑھی میں ہی دیکھی کہ جتنا ہاتھ پھیرو اتنی ہی چمکتی ہے۔ اعلیٰ ذات کی شیشم کی پہچان یہ کہ آرا، رندہ، برما سب کُھنڈے (کُند) اور ہاتھ شل ہو جائیں۔ یہ چیڑ تھوڑا ہی ہے کہ ایک ذرا کیل ٹھونکو تو الف سے لے کر ے تک چر جائے۔ پر ایک بات ہے۔ تازہ کٹی ہوئی چیڑ سے بن مہکار کا ایک آبشار پھوٹ پڑتا ہے۔ لگتا ہے اس میں نہایا جا رہا ہوں۔ جس دن کارخانے میں چیڑ کی کٹائی ہونے والی ہو، اس دن میں عطر لگا کر نہیں آتا"۔

قبلہ کا موڈ بدلا تو حاجی محمد اسحاق کی ہمت بندھی۔ کہنے لگے، یہ شیشم تو واقعی اعلیٰ درجہ کی معلوم ہوتی ہے، مگر سیزنڈ نہیں لگتی۔ قبلہ کے آگ ہی تو لگ گئی۔ فرمایا "سیزنڈ! کتنے فاقوں میں سیکھا ہے یہ لفظ؟ اگر فقط سیزنڈ ہی چاہیے تو سب سے زیادہ سیزنڈ سامنے والی مسجد کے غسلِ میّت کا تختہ ہے۔ بڑا پانی پیا ہے اس نے! لاؤں؟ اسی پہ لٹال دوں گا"۔

سائی کے ساتھ عزّتِ سادات بھی گئی

یوں تو ان کی زندگی ڈیل کارنیگی کے ہر اصول کی اوّل تا آخر نہایت کامیاب خلاف ورزی تھی، لیکن بزنس میں انہوں نے اپنے ہتھکنڈے الگ ایجاد کئے تھے۔ گاہک سے جب تک یہ نہ کہلوا لیں کہ لکڑی پسند ہے، اس کی قیمت اشارتاً بھی نہیں بتاتے تھے۔ وہ پوچھتا بھی تو صاف ٹال جاتے۔ "آپ بھی کمال کرتے ہیں۔ آپ کو لکڑی پسند ہے۔ لے جائیے۔ گھر کی بات ہے"۔ گاہک جب قطعی طور پر لکڑی پسند کر لیتا تو قبلہ قیمت بتائے بغیر، ہاتھ پھیلا کر بیعانہ طلب کرتے۔ سستا سماں تھا۔ وہ دونّی یا چونّی کی سائی پیش کرتا جو اس سودے کے لئے کافی ہوتی۔ اشارے سے دھتکارتے ہوئے کہتے، چاندی دکھاؤ (یعنی کم از کم ایک کلدار روپیہ نکالو)۔ وہ بچارا شرما حضوری ایک روپیہ نکالتا جو اس زمانے میں پندرہ سیر گیہوں یا سیر بھر اصلی گھی کے برابر ہوتا تھا۔ قبلہ روپیہ لے کر اپنی ہتھیلی پر اس طرح رکھے رہتے کہ اسے تسلّی کے لئے نظر تو آتا رہے، مگر جھپٹّا نہ مار سکے۔ ہتھیلی کو اپنے زیادہ قریب بھی نہ لاتے، مبادا سودا پٹنے سے پہلے ہی گاہک

بدک جائے۔ کچھ دیر بعد خود بخود کہتے "مبارک ہو! سودا پکا ہو گیا"۔ پھر قیمت بتاتے جسے سن کر وہ ہکا بکا رہ جاتا۔ وہ قیمت پر حجت کرتا تو کہتے "عجب گھن چکر ہو۔ سائی دے کے پھرتے ہو۔ ابھی روپیہ دے کے سودا پکا کیا ہے۔ ابھی تو اس میں سے تمہارے ہاتھ کی گرمائی بھی نہیں گئی اور ابھی پھر گئے۔ اچھا کہہ دو کہ یہ روپیہ تمہارا نہیں ہے۔ کہو، کہو" قیمت ناپ تول کر ایسی بتاتے کہ کائیاں سے کائیاں گاہک دُبدھا میں پڑ جائے اور یہ فیصلہ نہ کر سکے کہ پیشگی ڈوبنے میں زیادہ نقصان ہے یا اس بھاؤ لکڑی خریدنے میں۔

دورانِ حجت کتنی ہی گرما گرمی بلکہ ہاتھا پائی ہو جائے وہ اپنی ہتھیلی کو چت ہی رکھتے۔ مُٹھی کبھی بند نہیں کرتے تھے تاکہ بے آبرو ہوتے ہوئے گاہک کو اطمینان رہے کہ کم از کم سائی تو محفوظ ہے۔ ان کے بارے میں ایک قصہ مشہور تھا کہ ایک سر پھرے گاہک سے جھگڑا ہوا تو دھوبی پاٹ کا داؤں لگا کر زمین پر دے مارا اور چھاتی پر چڑھ کے بیٹھ گئے۔ لیکن اس پوز میں بھی اپنی ہتھیلی جس پر روپیہ رکھا تھا، چت ہی رکھی تاکہ اسے یہ بدگمانی نہ ہو کہ روپیہ ہتھیانا چاہتے ہیں۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ جیسی بے داغ اور اعلیٰ لکڑی وہ بیچتے تھے، ویسی بقول ان کے "تمہیں باغِ بہشت میں شاخِ طوبیٰ سے بھی دستیاب نہ ہو گی۔ داغی لکڑی بندے نے آج تک نہیں بیچی۔ سو سال بعد بھی دیمک لگ جائے تو پورے دام واپس کر دوں گا"۔ بات دراصل یہ تھی کہ وہ اپنے اصول کے پکّے تھے۔ مطلب یہ کہ تمام عمر "اونچی دکان، صحیح مال، غلط دام" پر سختی سے کاربند رہے۔ سنا ہے کہ دنیا کے سب سے بڑے فیشن ایبل اسٹور "ہیرڈز" کا دعویٰ ہے کہ ہمارے یہاں سوئی سے لے کر ہاتھی تک دستیاب ہے۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ قیمت بھی دونوں کی ایک ہی ہوتی ہے! ہیرڈز اگر لکڑی بیچتا تو بخدا ایسی ہی اور ان ہی داموں بیچتا۔

۲

یہ چھوڑ کر آئے ہیں

کانپور سے ہجرت کر کے کراچی آئے تو دنیا ہی اور تھی۔ اجنبی ماحول۔ بے روزگاری۔ بے گھری اس پر مستزاد۔ اپنی آبائی حویلی کے دس بارہ فوٹو مختلف زاویوں سے کھچوا لائے تھے۔ "ذرا یہ سائیڈ پوز دیکھیے۔ اور یہ شاٹ تو کمال کا ہے"۔ ہر آئے گئے کو فوٹو دکھا کر کہتے "یہ چھوڑ کر آئے ہیں" جن دفتروں میں مکان کے الاٹ منٹ کی درخواستیں دی تھیں ان کے بڑے افسروں

کو بھی کٹہرے کے اس پار سے تصویری ثبوتِ استحقاق دکھاتے: "یہ چھوڑ کر آئے ہیں"۔ واسکٹ اور شیروانی کی جیب میں اور کچھ ہو یا نہ ہو، حویلی کا فوٹو ضرور ہوتا تھا۔ یہ درحقیقت ان کا وزیٹنگ کارڈ تھا۔ کراچی کے فلیٹوں کو کبھی ماچس کی ڈبیاں، کبھی دڑبے، کبھی کابک کہتے۔ لیکن جب تین مہینے جوتیاں چٹخانے کے باوجود ایک کابک میں بھی سر چھپانے کو جگہ نہ ملی تو آنکھیں کھلیں۔ احباب نے سمجھایا "فلیٹ ایک گھنٹے میں مل سکتا ہے۔ کسٹوڈین کی ہتھیلی پر پیسہ رکھو اور جس فلیٹ کی چاہو چابی لے لو"۔ مگر قبلہ تو اپنی ہتھیلی پر پیسہ رکھوانے کے عادی تھے، وہ کہاں مانتے۔ مہینوں فلیٹ الاٹ کروانے کے سلسلے میں بھوکے پیاسے، پریشان حال سرکاری دفتروں کے چکّر کاٹتے رہے۔ زندگی بھر کسی کے مہمان نہ رہے تھے۔ اب بیٹی داماد کے ہاں مہمان رہنے کا عذاب بھی سہا۔

"اب کیا ہوئے گا؟"

انسان جب کسی گھُلا دینے والے کرب یا آزمائش سے گزرتا ہے تو ایک ایک ساعت ایک ایک برس بن جاتی ہے اور یوں لگتا ہے جیسے:

ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

بیٹی کے گھر ٹکڑے توڑنے یا اس پر بار بننے کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ کانپور میں کبھی اس کے ہاں کھڑے کھڑے ایک گلاس پانی بھی پیتے تو ہاتھ پر پانچ دس روپے رکھ دیتے۔ لیکن اب؟ صبح سر جھکائے ناشتہ کر کے نکلتے تو دن بھر خاک چھان کر مغرب سے ذرا پہلے لوٹتے۔ کھانے کے وقت کہہ دیتے کہ ایرانی ہوٹل میں کھا آیا ہوں۔ جوتے انہوں نے ہمیشہ رحیم بخش جفت ساز سے بنوائے، اس لئے کہ اس کے بنائے ہوئے جوتے چرچراتے بہت تھے۔ ان جوتوں کے تلے اب اتنے گھس گئے تھے کہ چرچرانے کے لائق نہ رہے۔ پیروں میں ٹھیکیں پڑ گئیں۔ شیروانیاں ڈھیلی ہو گئیں۔ بیمار بیوی رات کو درد سے کراہ بھی نہیں سکتی تھی کہ سمدھیانے والوں کی نیند خراب ہونے کا اندیشہ تھا۔ ململ کے کُرتوں کی لکھنوی کڑھائی میل میں چھپ گئی۔ چُنٹیں نکلنے کے بعد آستینیں انگلیوں سے ایک ایک بالشت نیچے لٹکی رہتیں۔ خضابی مونچھوں کا بل تو نہیں گیا، لیکن صرف بل کھائی ہوئی نوکیں سیاہ رہ گئیں۔ چار چار دن نہانے کو پانی نہ ملتا۔ موتیا کا عطر لگائے تین مہینے ہو گئے۔

بیوی گھبرا کر بڑے بھولپن سے مضافاتی لہجے میں کہتیں "اب کیا ہوئے گا؟" ہو گا کے بجائے ہوئے گا ان کے منہ سے بہت پیارا لگتا تھا۔ اس ایک فقرے میں وہ اپنی ساری

سراسیمگی، معصومیت، بے بسی اور مخاطب کے علم نجوم اور اس کی بے طلب مدد پر بھروسا ——— سبھی کچھ سمو دیتی تھیں۔ قبلہ اس کے جواب میں ہمیشہ بڑے اعتماد اور تمکنت سے "دیکھتے ہیں" کہہ کر ان کی تشفی کر دیتے تھے۔

یہ زورِ دست و ضربتِ کاری کا ہے مقام

ہر دکھ، ہر عذاب کے بعد زندگی آدمی پر اپنا ایک راز کھول دیتی ہے۔ بودھ گیا کی چھاؤں تلے بُدھ بھی ایک دکھ بھری تپسیا سے گزرے تھے۔ جب پیٹ پیٹھ سے لگ گیا، آنکھیں اندھے کنوؤں کی تہ میں بے نور ہوئیں اور ہڈیوں کی مالا میں بس سانس کی ڈوری اٹکی رہ گئی، تو گوتم بدھ پر بھی ایک بھید کھلا تھا۔ جیسا اور جتنا اور جس کارن آدمی دکھ بھوگتا ہے، ویسا ہی بھید اس پر کھلتا ہے۔ نروان ڈھونڈنے والے کو نروان مل جاتا ہے۔ اور جو دنیا کی خاطر کشٹ اٹھاتا ہے تو دنیا اس کو راستہ دیتی چلی جاتی ہے۔

سو گلی گلی خاک پھانکنے اور دفتر دفتر دھکے کھانے کے بعد قبلہ کے قلبِ حزیں پر کچھ القا ہوا۔ وہ یہ کہ قاعدے قانون داناؤں اور جابروں نے کمزور دل والوں کو قابو میں رکھنے کے لئے بنائے ہیں۔ جو شخص ہاتھی کی لگام ہی تلاش کرتا رہ جائے وہ کبھی اس پر چڑھ نہیں سکتا۔ جام اس کا ہے جو بڑھ کر خود ساقی کو جام و مینا سمیت اٹھا لے۔ بالفاظ دیگر، جو بڑھ کر تالا توڑ ڈالے، مکان اسی کا ہو گیا۔ کانپور سے چلے تو اپنی جمع جتھا، شجرہ، اسپرنگ سے کھلنے والا چاقو، اختری بائی فیض آبادی کے تین ریکارڈ، مراد آبادی حقّے اور صراحی کے سبز کیریر اسٹینڈ کے علاوہ اپنی دکان کا تالا بھی ڈھو کر لے آئے تھے۔ علیگڑھ سے خاص طور پر بنوا کر منگوایا تھا۔ تین سیر سے کم کا نہ ہو گا۔ مذکورہ بالا القا کے بعد برنس روڈ پر ایک اعلیٰ درجہ کا فلیٹ اپنے لئے پسند فرمایا۔ ماربل کی ٹائلز، سمندری ہوا کے رخ کھلنے والی کھڑکیاں جن میں رنگین شیشے لگے تھے۔ دروازے کے زنگ آلود تالے پر اپنے علیگ تالے کی ایک ہی ضرب سے فلیٹ میں اپنی آباد کاری بلا منتِ سرکار کر لی۔ گویا پروفیسر قاضی عبدالقدوس کے الفاظ میں، اول الذکر کو ثانی الذکر پر مار کر آخر الذکر کا قبضہ لے لیا۔ تختی دوبارہ پینٹ کروا کے لگا دی۔ اس سے پہلے اس پر "کسٹوڈین متروکہ املاک" کا نام لکھا تھا۔ قبلہ عالم جلال میں اسے وہیں سے کیلوں سمیت اکھاڑ لائے تھے۔ تختی پر نام کے آگے مضطر کانپوری بھی لکھوا دیا۔ پرانے واقف کاروں نے پوچھا "آپ شاعر کب سے ہو گئے؟" فرمایا "میں نے آج تک کسی شاعر پر دیوانی مقدمہ چلتے نہیں دیکھا۔ نہ ڈگری، قُرقی ہوتے دیکھی!"

فلیٹ پر قابض ہونے کے کوئی چار ماہ بعد قبلہ اپنے چوڑی دار کا گھٹنا رفو کر رہے تھے کہ کسی نے بڑے گستاخانہ انداز سے دروازہ کھٹکھٹایا۔ مطلب یہ کہ نام کی تختی کو پھٹ پھٹایا۔ جیسے ہی انہوں نے ہڑبڑا کر دروازہ کھولا، آنے والے نے خود کا تعارف اس طرح کرایا گویا اپنے عہدے کی چپڑاس ان کے منہ پر اٹھا کے دے ماری: "افسر، محکمہ کسٹوڈین، ایویکوی پراپرٹی" پھر ڈپٹ کر کہا "بڑے میاں! فلیٹ کا الاٹ منٹ آرڈر دکھاؤ" قبلہ نے واسکٹ کی جیب سے حویلی کا فوٹو نکال کر دکھایا "یہ چھوڑ کر آئے ہیں"۔ اس نے فوٹو کا نوٹس نہ لیتے ہوئے قدرے درشتی سے کہا "بڑے میاں! سنا نہیں؟ الاٹ منٹ آرڈر دکھاؤ"۔ قبلہ نے بڑی رسان سے اپنے بائیں پیر کا سلیم شاہی جوتا اتارا، اور اتنی ہی رسان سے کہ اس کو گمان تک نہ ہوا کیا کرنے والے ہیں، اس کے منہ پر مارتے ہوئے بولے "یہ ہے یاروں کا الاٹ منٹ آرڈر! کاربن کاپی بھی ملاحظہ فرمائیے گا؟" اس نے اب تک، یعنی تادمِ تذلیل، رشوت ہی رشوت کھائی تھی، جوتے نہیں کھائے تھے۔ پھر کبھی ادھر کا رُخ نہیں کیا۔

جس حویلی میں تھا ہمارا گھر

قبلہ نے بڑے جتن سے لی مارکٹ میں ایک چھوٹی سی لکڑی کی دکان کا ڈول ڈالا۔ بیوی کے جہیز کے زیور اور ویسلی اسکاٹ کی بندوق اونے پونے بیچ ڈالی۔ کچھ مال ادھار خریدا۔ ابھی دکان ٹھیک سے جمی بھی نہ تھی کہ ایک انکم ٹیکس انسپکٹر آنکلا۔ کھاتے، رجسٹریشن، روکڑ بہی اور رسید بک طلب کیں۔ دوسرے دن قبلہ ہم سے کہنے لگے "مشتاق میاں! سنا آپ نے؟ مہینوں جوتیاں چٹخاتا، دفتروں میں اپنی اوقات خراب کرواتا پھرا۔ کسی نے پلٹ کر نہ پوچھا کہ بھیا کون ہو! اب دل لگی دیکھئے، کل ایک انکم ٹیکس کا تیس مار خان دندناتا آیا۔ لقہ کبوتر کی طرح سینہ پھلائے۔ میں نے سالے کو یہ دکھادی "یہ چھوڑ کر آئے ہیں" چندرا کر پوچھنے لگا "یہ کیا ہے؟ ہم نے کہا "ہمارے ہاں اسے محل سرا کہتے ہیں"۔

سچ جھوٹ کا حال مرزا جانیں کہ انہیں سے روایت ہے کہ اس محل سرا کا ایک بڑا فوٹو فریم کروا کے اپنے فلیٹ کی کاغذی سی دیوار میں کیل ٹھونک رہے تھے کہ دیوار کے اس پار والے پڑوسی نے آکر درخواست کی کہ ذرا کیل ایک فٹ اوپر ٹھونکیں تاکہ دوسرے سرے پر میں اپنی شیروانی لٹکا سکوں۔ دروازہ زور سے کھولنے اور بند کرنے کی دھمک سے اس زنگیائی کیل پر ساری محل سرا پنڈولم کی طرح جھولتی رہتی تھی۔ گھر میں ڈاکیا یا نئی دھوبن بھی آتی تو اسے بھی دکھاتے "یہ

چھوڑ کر آئے ہیں"۔

اس حویلی کا فوٹو ہم نے بھی بارہا دیکھا۔ اسے دیکھ کر ایسا لگتا تھا جیسے کیمرے کو موٹا نظر آنے لگا ہے۔ لیکن کیمرے کے ضعفِ بصارت کو قبلہ اپنے زورِ بیان سے دور کر دیتے تھے۔ یوں بھی ماضی ہر شے کے گرد ایک رومانی ہالہ کھینچ دیتا ہے۔ گزرا ہوا درد بھی سہانا لگتا ہے۔ آدمی کا جب سب کچھ چھن جائے تو وہ یا تو مست ملنگ ہو جاتا ہے یا کسی فینٹیسی لینڈ میں پناہ لیتا ہے۔

نہ ہو اگر یہ فریبِ پیہم تو دم نکل جائے آدمی کا

شجرہ اور حویلی بھی ایک ایسی ہی جائے اماں تھی۔ ممکن ہے بے ادب نگاہوں کو یہ تصویر میں ڈھنڈار دکھلائی دے، لیکن جب قبلہ اس کی تعمیراتی نزاکتوں کی تشریح فرماتے تو اس کے آگے تاج محل بالکل سیدھا سپاٹ گنوار و گھروندا معلوم ہوتا۔ مثلاً دوسری منزل پر ایک دروازہ نظر آتا تھا جس کی چوکھٹ اور کواڑ جھڑ چکے تھے۔ قبلہ اسے فرانسیسی دریچہ بتاتے تھے۔ اگر یہاں واقعی کوئی ولایتی دریچہ تھا تو یقیناً یہ وہی دریچہ ہو گا جس میں جڑے ہوئے آئینۂ جہاں نما کو توڑ کر ساری کی ساری ایسٹ انڈیا کمپنی آنکھوں میں اپنے جوتوں کی دُھول جھونکتی گزر گئی۔ ڈیوڑھی میں داخل ہونے کا جو بے کواڑ پھاٹک تھا وہ دراصل شاہ جہانی محراب تھی۔ اس کے اوپر ایک ٹوٹا ہوا چھجا تھا جس پر سرِدست ایک چیل قیلولہ کر رہی تھی۔ یہ راجپوتی جھروکے کی باقیات بتائی جاتی تھیں، جن کے عقب میں ان کے دادا کے وقتوں میں ایرانی قالینوں پر آذربائیجانی طرز کی قوالی ہوتی تھی۔ پچھلے پہر جب نیند کے غلبے سے غلافی آنکھیں مندنے لگتیں تو وقفے وقفے سے نقرئی گلاب پاشوں سے حضّارِ محفل پر عرق گلاب مقطّر چھڑکا جاتا۔ فرش اور دیواریں قالینوں سے ڈھکی رہتی تھیں۔ فرماتے تھے کہ "جتے پھول غلیچے پہ تھے وِتے ہی باہر بغیچے میں تھے"۔ یہاں اطالوی مخمل کے کار چوبی زیر انداز پر گنگا جمنی منقّش اگالدان رکھے رہتے تھے، جن میں چاندی کے ورق میں لپٹی ہوئی گلوریوں کی پیک جب تھوکی جاتی تو بلّوریں گلے میں اترتی چڑھتی صاف نظر آتی، جیسے تھرمامیٹر میں پارا۔

وہ ازدحام کہ عقل دھرنے کی جگہ نہیں

حویلی کے چند اندرونی کلوز اَپ بھی تھے۔ کچھ کیمرے کی آنکھ اور کچھ چشمِ تصور کے رہینِ منّت۔ ایک سہ دری تھی جس کی دو محرابوں کی دراڑوں میں بازنطینی اینٹوں پر کانپوری چڑیوں کے گھونسلے نظر آ رہے تھے۔ ان پر Moorish arches کی تہمت تھی۔ چراغ رکھنے

کا ایک آلا (طاقچہ) ایسے آرٹسٹک زاویے سے ڈبا تھا کہ پرتگالی آرچ کے آثار دکھلائی پڑتے تھے۔ فوٹو میں، اس کے پہلو میں ایک چوبی گھڑونچی نظر آرہی تھی جس کا شاہ جہانی ڈیزائن ان کے جد نے آب دار خانۂ خاص سے بدستِ خود چُرایا تھا۔ شاہ جہانی ہو یا نہ ہو، اس کے مغل ہونے میں کوئی شبہ نہ تھا، اس لیے کہ اس کی ایک ٹانگ تیموری تھی۔ حویلی کی غلام گردشیں فوٹو میں نظر نہیں آتی تھیں، لیکن ایک ہمسائے کا بیان ہے کہ ان میں گردش کے مارے خاندانی بڑے بوڑھے رُلے پھرتے تھے۔ شمالی حصے میں ایک ستون جو مدتیں ہوئیں چھت کا بوجھ اپنے اوپر سے اوچھے کے احسان کی طرح اتار چکا تھا، Roman Pillars کا نادر نمونہ بتایا جاتا تھا۔ حیرت تھی کہ یہ چھت سے پہلے کیوں نہ گرا۔ اس کی ایک وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ چاروں طرف گردن گردن ملبے میں دبے ہونے کے باعث، اس کے گرنے کے لئے کوئی خالی جگہ نہ تھی۔ ایک شکستہ دیوار کے ساتھ لکڑی کی بوسیدہ نسینی (سیڑھی) اس طرح کھڑی تھی کہ یہ کہنا مشکل تھا کہ کون کس کے سہارے کھڑا ہے۔ ان کے بیان کے مطابق جب دوسری منزل منہدم نہیں ہوئی تھی تو یہاں وکٹورین اسٹائل کا Grand staircase ہوا کرتا تھا۔ اُس غیر موجود چھت پر جہاں اب چمگادڑیں بھی نہیں لٹک سکتی تھیں، قبلہ ان آہنی کڑیوں کی نشاندہی کرتے جن میں دادا کے زمانے میں المانوی فانوس لٹکے رہتے تھے، جن کی چمپئی روشنی میں وہ گھنگھرالی خنجریاں بجتیں جو کبھی دو کوہان والے باختری اونٹوں کی محمل نشینوں کے ساتھ آئی تھیں۔ اگر یہ فوٹو ان کی رنگ کمنٹری کے ساتھ نہ دیکھے ہوتے تو کسی طرح یہ قیاس و ذہن میں نہیں آسکتا تھا کہ پانچ سو مربع گز کی ایک لڑکھڑاتی حویلی میں اتنے فنونِ تعمیر اور ڈھیر ساری تہذیبوں کا ایسا گھمسان کا ازدحام ہو گا کہ عقل دھرنے کی جگہ نہ رہے گی۔ پہلی مرتبہ فوٹو دیکھیں تو خیال ہوتا تھا کہ کیمرہ ہل گیا ہے۔ پھر ذرا غور سے دیکھیں تو حیرت ہوتی تھی کہ یہ ڈھنڈار حویلی اب تک کیسے کھڑی ہے۔ مرزا کا خیال تھا کہ اب اس میں گرنے کی بھی طاقت نہیں رہی۔

وہ ترا کوٹھے پہ ننگے پاؤں آنا یاد ہے

حویلی کے صدر دروازے سے چند قدم کے فاصلے پر جہاں فوٹو میں گھورے پر ایک کالا مرغا گردن پُھلائے اذان دے رہا تھا، وہاں ایک شکستہ چبوترے کے آثار نظر آرہے تھے۔ اس کے پتھروں کے جوڑوں اور درزوں میں سے پودے روشنی کی تلاش میں گھبرا کر باہر نکل پڑے تھے۔ ایک دن اس چبوترے کی طرف اشارہ کر کے فرمانے لگے کہ یہاں آبِ مصفّا سے لبریز سنگِ سرخ کا ہشت پہلو حوض ہوا کرتا تھا جس میں ولایتی گولڈ فش تیرتی رہتی تھیں۔ عارف

میاں اس میں پایونیر اخبار کی کشتیاں تیرایا کرتے تھے۔ یہ کہتے کہتے قبلہ جوشِ بیان میں اپنی چھڑی لے کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ اس سے پھٹی ہوئی دری پر ہشت پہلو حوض کا نقشہ کھینچنے لگے۔ ایک جگہ فرضی لکیر قدرے ٹیڑھی کھنچی تو اسے پیر سے رگڑ کر مٹایا۔ چھڑی کی نوک سے اس بدذات مچھلی کی طرف اشارہ کیا جو سب سے لڑتی پھرتی تھی۔ پھر ایک کونے میں اس مچھلی کی بھی نشان دہی کی جس کا جی ماندہ تھا۔ انہوں نے کھل کر تو نہیں کہا کہ آخر ہم ان کے خورد تھے، لیکن ہم سمجھ گئے کہ اس مچھلی کا جی کھٹی چیزیں اور سوندھی مٹی کھانے کو بھی چاہ رہا ہو گا۔

قبلہ کبھی ترنگ میں آتے تو اپنے اکلوتے بے تکلف دوست رئیس احمد قدوائی سے فرماتے کہ جوانی میں مئی جون کی ٹیک دوپہریا میں ایک حسین دوشیزہ کا کوٹھوں کوٹھوں تنگے پیر ان کی حویلی کی تپتی چھت پر آنا، اب تک (مع ڈائلاگ) یاد ہے۔ یہ بات مرزا کی سمجھ میں آج تک نہ آئی۔ اس لئے کہ ان کی حویلی سہ منزلہ تھی، جب کہ دائیں بائیں پڑوس کے دونوں مکان ایک ایک منزلہ تھے۔ حسین دوشیزہ اگر ننگے پیر ہو اور زیورِ حیا اتارنے کے لئے اتاؤلی بھی ہو، تب بھی یہ کرتب ممکن نہیں، تاوقتے کہ حسینہ ان کے عشق میں دوشیزہ ہونے کے علاوہ دولخت بھی نہ ہو جائے۔

پِلکھن

فوٹو میں حویلی کے سامنے ایک چھتنار پِلکھن * اداس کھڑی تھی۔ اس کا تُخم ان کے جدِ اعلیٰ سمندِ سیاہ زانو پر سوار، کارچوبی کام کے چُغے میں چھپا کر قحط کے زمانے میں دمشق سے لائے تھے۔ قبلہ کے قول کے مطابق، ان کے پردادا کے ابا جان کہا کرتے تھے کہ "بے سروسامانی کے عالم میں یہ تنگِ خلائق، تنگِ اسلاف، تنگِ وطن ——— تنگے سر، تنگے پیر، گھوڑے کی تنگی پیٹھ پر، تنگی تلوار ہاتھ میں لئے ——— خیبر کے سنگلاخ تنگے پہاڑوں کو پھلانگتا، واردِ ہندوستان ہوا"۔ جو تصویر وہ فخریہ کھینچتے تھے اس سے تو یہی ظاہر ہوتا تھا کہ اس وقت بزرگوار کے پاس ستر پوشی کے لئے گھوڑے کی دم کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ جائداد، محل سرا، خُدّام، مال و متاع ———

---

* پِلکھن: جن پڑھنے والوں نے یہ درخت نہیں دیکھا، وہ اس کی تصویر قراۃ العین حیدر کے "کارِ جہاں دراز ہے" میں ملاحظہ فرما سکتے ہیں۔ ہم نے بھی اس درخت کا فوٹو ہی دیکھا ہے۔ یہاں ہمارے پاس جتنے لغات ہیں ان میں یہ لفظ نہیں ہے۔ تذکیر و تانیث کا بھی علم نہیں۔ لیکن جس پیار اور للک سے اس کا ذکر کیا گیا اس پر ہم نے قیاس کیا کہ مؤنث ہی ہو گا۔

سب کچھ وہیں چھوڑ آئے۔ البتہ اثاث البیت کا سب سے قیمتی حصہ یعنی شجرۂ نسب اور پِلکھن کا تخم ساتھ لے آئے۔ گھوڑا جو انہی کی طرح نجیب الطرفین اور وطنِ مالوف سے بیزار تھا، تخم اور شجرے کے بوجھ سے رانوں تلے سے نکلا پڑ رہا تھا۔

شجرے کی ہر شاخ پہ نابغہ بیٹھا تھا

زندگی کی دھوپ جب کڑی ہوئی اور پیروں تلے سے زمین جائداد نکل گئی تو آیندہ نسلوں نے اسی شجر اور شجرے کے سائے تلے بِسرام کیا۔ قبلہ کو اپنے بزرگوں کی ذہانت و فطانت پر بڑا ناز تھا۔ ان کا ہر بزرگ نادرۂ روزگار تھا، اور اُن کے شجرے کی ہر شاخ پر ایک نابغہ بیٹھا اونگھ رہا تھا۔

قبلہ نے ایک فوٹو اس پلکھن کے نیچے ٹھیک اس جگہ کھڑے ہو کر کھچوایا تھا جہاں ان کی نال گڑی تھی۔ فرماتے تھے، اگر کسی تخمِ ناتحقیق کو میری حویلی کی ملکیت میں شبہ ہو تو نال نکال کر دیکھ لے۔ جب آدمی کو یہ نہ معلوم ہو کہ اس کی نال کہاں گڑی ہے اور پُرکھوں کی ہڈیاں کہاں دفن ہیں، تو وہ منی پلانٹ کی طرح ہو جاتا ہے جو مٹی کے بغیر صرف بوتلوں میں پھلتا پھولتا ہے۔ اپنی نال، پُرکھوں اور پِلکھن کا ذکر اتنے فخر، غلو اور کثرت سے کرتے کرتے یہ احوال ہوا کہ پِلکھن کی جڑیں شجرے میں اتر آئیں، جیسے گھٹنوں میں پانی اتر آتا ہے۔

اِمپورٹڈ بزرگ اور یونانی ناک

وہ زمانے اور تھے۔ شرافت اور نجابت کے معیار بھی مختلف تھے۔ جب تک بزرگ اصلی امپورٹڈ یعنی ماوراءالنہری اور خیبر کے اُس پار سے آئے ہوئے نہ ہوں، کوئی ہندوستانی مسلمان خود کو عزت دار اور نجیب نہیں گردانتا تھا۔ غالب کو تو شیخی بگھارنے کے لئے اپنا (فرضی) استاد ملّا عبدالصمد تک ایران سے امپورٹ کرنا پڑا۔ قبلہ کے بزرگوں نے جب بے روزگاری اور عُسرت سے تنگ آکر وطن چھوڑا تو آنکھیں نم اور دل گداز تھے۔ بار بار اپنا دستِ افسوس زانوئے اسپ پر مارتے اور ایک راوی شیوہ بیان کے بقول، ایک دوسرے کی داڑھی پر ہاتھ پھیر کے استغفراللہ! استغفراللہ! کہتے۔ تازہ ولایت جس سے ملے، اپنے حسنِ اخلاق سے اس کا دل جیت لیا۔

پہلے جاں، پھر جانِ جاں، پھر جانِ جاناں ہو گئے

پھر یہی پیارے لوگ بتدریج

پہلے خاں، پھر خانخاں، پھر خانخاناں ہو گئے!

حویلی کے آرکی ٹیکچر کی طرح قبلہ کے امراض بھی شاہانہ ہوتے تھے۔ بچپن میں دائیں

رخسار پر غالباً آموں کی فصل میں پُھنسی نکلی تھی جس کا داغ ہنوز باقی تھا۔ فرماتے تھے، جس سال میرے یہ اورنگ زیبی پھوڑا نکلا، اسی سال بلکہ اسی ہفتے ملکہ وکٹوریہ رانڈ ہوئی۔ ساٹھ کے پیٹے میں آئے تو شاہجہانی حبسِ بول میں مبتلا ہو گئے۔ فرماتے تھے کہ غالب مغل بچہ تھا۔ ستم پیشہ ڈومنی کو اپنے زہرِ عشق سے مار ڈالا۔ مگر خود اسی، گویا کہ میرے والے عارضے میں مرا۔ ایک خط میں مرقوم ہے کہ جُرعہ جُرعہ پیتا ہوں اور قطرہ قطرہ خارج کرتا ہوں۔ دمے کا دورہ ذرا تھمتا تو قبلہ بڑے فخر سے فرماتے کہ فیضی کو بھی یہی مرض لاحق تھا۔ اس نے ایک قطعہ میں کہا ہے کہ دو عالم میرے سینے میں سما گئے، مگر آدھا سانس کسی طور نہیں سما رہا! اپنے والد مرحوم کے بارے میں فرماتے تھے کہ راج روگ یعنی اکبری سنگرہنی میں انتقال فرمایا۔ مراد اس سے آنتوں کی ٹی بی تھی۔ مرض تو مرض، قبلہ کی ناک تک اپنی نہیں تھی۔ یونانی بتاتے تھے۔

۳

”مُردہ“ از غیب بروں آید و کارے بکند

قبلہ کو دو غم تھے۔ پہلے غم کا ذکر بعد میں آئے گا کہ وہ جانگسل تھا۔ دوسرا غم دراصل اتنا ان کا اپنا نہیں جتنا بیوی کا تھا جو بیٹے کی تمنا میں گُھل رہی تھیں۔ اس غریب نے بڑی منتیں مانیں۔ قبلہ کو شربت میں نقش گھول گھول کر پلائے۔ ان کے تکیے کے نیچے تعویذ رکھے۔ چُھپ چُھپ کر مزاروں پر چادریں چڑھائیں۔ ہمارے ہاں لوگ جب زندوں سے مایوس ہو جاتے ہیں تو ایک ہی آس باقی رہ جاتی ہے:

مُردہ از غیب بروں آید و کارے بکند

پچاس میل کے دائرے میں کوئی مزار ایسا نہ بچا جس کے سرہانے کھڑے ہو کر وہ اس طرح پُھوٹ پُھوٹ کر نہ روئی ہوں کہ اہل قبر کے پسماندگان بھی تدفین کے وقت یوں نہ روئے ہوں گے۔ اُس زمانے کے اہل القبور، صاحب کرامات ہوں یا نہ ہوں، کم از کم قبر کے اندر ضرور ہوتے تھے۔ آج کل جیسا حال نہیں تھا کہ مزار اگر خالی از میّت ہے تو غنیمت جانئے، ورنہ اللہ جانے اندر کیا دفن ہے جس کا اس دُھوم سے عُرس شریف منایا جا رہا ہے۔ کوئی دن نہیں جاتا کہ کراچی کے اخباروں میں ایسے اشتہار نہ دیکھتے ہوں کہ آج فلاں آستانۂ عالیہ پر چادر شریف چڑھائی جا رہی ہے۔ پانچ بجے گاگر شریف، جلوس کی شکل میں لے جائی جائے گی۔ پھر اس سے مزار شریف کو غسل شریف دیا

جائے گا۔ بعد نماز مغرب لنگر شریف تقسیم ہو گا۔ ہم نے بعض نو دریافت بزرگوں کے نو تعمیر مزاروں کے ضمن میں "شریف" پر تاکیداً اتنا زور دیکھا ہے کہ دل میں طرح طرح کے وسوسے اٹھنے لگتے ہیں۔ ہم نہ ضعیف الاعتقاد ہیں نہ وہابی، لیکن کراچی کے ایک مزار کے بارے میں جو ہمارے سامنے پُر ہوا ہے، ہم بالاعلان یہ تسلیم کرنے کے لئے تیار ہیں کہ اس سے متعلق ہر چیز شریف ہے، سوائے صاحبِ مزار کے۔

خیر، یہ تو ایک جملۂ معترضہ تھا جو روانی میں پھیل کر پورا پیرا بن گیا۔ عرض یہ کرنا تھا کہ قبلہ خود کو کسی زندہ پیر سے کم نہیں سمجھتے تھے۔ انہیں جب یہ پتا چلا کہ بیوی اولادِ نرینہ کی منت مانگنے چوری چھپے نامحرموں کے مزاروں پر جانے لگی ہیں تو بہت خفا ہوئے۔ وہ جب بہت خفا ہوتے تو کھانا چھوڑ دیتے تھے۔ حلوائی کی دکان سے ربڑی، موتی چُور کے لڈو اور کچوری لا کر کھا لیتے۔ دوسرے دن بیوی کاسنی رنگ کا دوپٹا اوڑھ لیتیں اور ان کے پسندیدہ کھانے یعنی دو پیازہ، ڈیوڑھی شکر والا زردہ اور بہت تیز مرچوں کے ماش کے دہی بڑے کھلا کر انہیں منا لیتیں۔ قبلہ انہی مرغوبات پر اپنے ایرانی اور عربی النسل بزرگوں کی نیاز دلواتے۔ البتہ ان کے دہی بڑوں میں مرچیں برائے نام ڈلواتے۔ مزاروں پر حاضری پر قدغن بڑھا۔ بیوی بہت روئیں دھوئیں تو قبلہ کچھ پگھلے۔ مزاروں پر جانے کی اجازت دے دی، مگر اس شرط پر کہ مزار کا مکین "ذات کا کمبوہ نہ ہو۔ کمبوہ مرد اور غزل گو شاعر سے پردہ لازم ہے، خواہ وہ مُردہ ہی کیوں نہ ہو۔ میں ان کے رگ و ریشہ سے واقف ہوں"۔ ان کے دشمنوں سے روایت ہے کہ قبلہ خود بھی جوانی میں شاعر اور تھیال کی طرف سے کمبوہ تھے۔ اکثر فرماتے "مرگِ کمبوہ جشنے دارد"۔

کٹ کھنے بِلاؤ کے گلے میں گھنٹی

رفتہ رفتہ بیوی کو صبر آگیا۔ ایک بیٹی تھی۔ قبلہ کو وہ عزیز سے عزیز تر ہوتی گئی۔ انہیں اس حد تک صبر آگیا کہ اکثر فرماتے، خدا بڑا رحیم و کریم ہے۔ اس نے بڑا فضل کیا کہ بیٹا نہ دیا۔ اگر مجھ پر پڑتا تو تمام عمر خوار ہوتا۔ اور اگر نہ پڑتا تو ناخلف کو عاق کر دیتا۔

سیانی بیٹی، کتنی بھی چہیتی ہو، ماں باپ کی چھاتی پر پہاڑ ہوتی ہے۔ لڑکی، ضرورتِ رشتہ کی اشتہاری اصطلاحوں کے مطابق، قبول صورت، سلیقہ شعار، خوش اطوار، امور خانہ داری سے بخوبی واقف۔ لیکن کس کی شامت آئی تھی کہ قبلہ کی بیٹی کا پیام دے۔ ہمیں آتشِ نمرود میں کُودنے کا ذاتی تجربہ تو نہیں، لیکن وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ آتشِ نمرود میں بے خطر کودنے سے

کہیں زیادہ خطرناک کام نمرود کے شجرہ نسب میں کُود پڑنا ہے ۔ جیسا ہم پہلے عرض کر چکے ہیں، قبلہ ہمارے دوست بشارت کے پھوپا، چچا اور اللہ جانے کیا کیا لگتے تھے ۔ دکان اور مکان، دونوں اعتبار سے، پڑوسی بھی تھے ۔ بشارت کے والد بھی رشتے کے حق میں تھے، لیکن رقعہ بھیجنے سے صاف انکار کر دیا کہ بہو کے بغیر پھر بھی گزارا ہو سکتا ہے، لیکن ناک اور ٹانگ کے بغیر تو شخصیت نامکمل سی معلوم ہوگی ۔ بشارت نے ریل کی پٹڑی سے خود کو بندھوا کر بڑی لائن کے انجن سے اپنی خودکشی کروانے کی دھمکی دی ۔ رسیّوں سے بندھوانے کی شرط خود اس لئے لگا دی کہ عین وقت پر اٹھ کر بھاگ نہ جائیں ۔ لیکن ان کے والد نے صاف کہہ دیا کہ اس کٹ کھنے بِلاؤ کے گلے میں تمہیں گھنٹی ڈالو ۔

قبلہ "مُدمّغ" بدلحاظ، منہ پھٹ مشہور ہی نہیں، تھے بھی ۔ وہ دل سے ——— بلکہ بے دلی سے بھی ——— کسی کی عزّت نہیں کرتے تھے ۔ دوسرے کو حقیر سمجھنے کا کچھ نہ کچھ جواز ضرور نکال لیتے ۔ مثلاً اگر کسی کی عمر ان سے ایک مہینہ بھی کم ہو تو اسے لونڈا کہتے اور اگر ایک سال زیادہ ہو تو بُڑھئو!

ب و س ہ اور چار نقطے

بشارت نے ان دنوں بی ۔ اے کا امتحان دیا تھا اور پاس ہونے کا امکان، بقول ان کے ، فِفٹی فِفٹی تھا ۔ فِفٹی فِفٹی اتنے زور، فخر اور وثوق سے کہتے تھے گویا اپنی کانٹا تول نِصفا نِصف نالائقی سے ممتحن کو کڑی آزمائش میں ڈال دیا ہے ۔ فرصت ہی فرصت تھی ۔ کیرم اور کوٹ پیس کھیلتے ۔ روحوں کو بُلاتے اور ان سے ایسے سوال کرتے کہ زندوں کو حیا آتی ۔ کبھی دن بھر بیٹھے نظیر اکبر آبادی کے کلّیات میں وہ نقطے والے بلینک پُر کرتے رہتے جو منشی نول کشور پریس نے بہ تقاضائے تہذیب و تعزیراتِ ہند خالی چھوڑ دیے تھے ۔ گفتگو میں ہر جملے کے بعد شعر کا "ٹھیکا" لگاتے ۔ افسانہ نویسی کی مشق و مشقّت بھی جاری تھی ۔ نیاز فتح پوری کی اطلسی فقرہ طرازی اور ابوالکلام کی جھومتی جھامتی کج کامنی نثر کی چھاپ، ایک انہی پر موقوف نہیں ، اچھے اچھوں کی طرزِ تحریر پر تھی ۔ بعضوں پر ماتھے کے جھومر کی مانند ۔ کچھ پر دھوبی کے نشان کی طرح ۔ اور کچھ پر اس طرح جیسے انگریز ملّاح اپنی محبوباؤں کی تصویریں جسم پر گُدوا لیتے ہیں ۔ جب ذرا گردن جھکائی دیکھ لی ۔ کسی کی محتاجی نہیں ۔ اردو نثر اس زمانے میں فیل پا میں مبتلا تھی ۔ اس میں کچھ افاقہ ہوا تو معجونِ فلک سیر کھا کر ٹیگوری ادب پاروں کے اڑن غالیچے پر سوار ہو گئی ۔ بشارت کے ایک افسانے کا کلائمکس کچھ اس طرح تھا:

"انجم آرا کی حُسن آفرینیوں، سحر انگیزیوں اور حشر سامانیوں سے مشام جان معطّر تھا ۔ وہ لغزیدہ لغزیدہ قدموں سے آگے بڑھی اور فرطِ حیا سے اپنی اطلسی بانہوں کو اپنی ہی دُزدیدہ دُزدیدہ آنکھوں پر رکھا ۔ سلیم نے انجم آرا کے دستِ حنائی کو اپنے آہنی ہاتھ میں لے کر پتھرائی ہوئی آنکھوں سے اس کی ہیرا تراش کلائی اور ساقِ بلوریں کو دیکھا اور گُلنار سے لبوں پر ۔۔۔۔ چار نقطے ثبت کر دیے۔" اس زمانے میں لفظ "بوسہ" فحش سمجھا جاتا تھا ۔ لہٰذا اس کی جگہ نقطے لگا دیئے جاتے تھے ۔ بشارت گِن کر اتنے ہی نقطے لگاتے جن کی اجازت اُس وقت کے حالات، حیا یا ہیروئن نے دی ہو۔ ہمیں اچھی طرح یاد ہے کہ اس زمانے میں انجمن ترقی اردو کے رسالے میں ایک مضمون چھپا تھا ۔ اس میں جہاں جہاں لفظ بوسہ آیا، وہاں مولوی عبدالحق نے بربنائے تہذیب اس کے ہجّے یعنی ب و س ہ چھاپ کر اُلٹا اس کی لذّت و طوالت میں اضافہ فرما دیا ۔ یہاں ہمیں ان کا یا اپنے حبیب لبیب کی طرزِ نگارش کا مذاق اڑانا مقصود نہیں ۔ ہر زمانے کا اپنا اسلوب اور آہنگ ہوتا ہے ۔ لفظ کبھی انگرکھا، کبھی عبا و عمامہ، کبھی ڈنر جیکٹ یا فُولس کیپ، کبھی پیر میں پائل یا بیڑی پہنے نظر آتے ہیں ۔ اور کبھی کوئی مداری اپنی قاموسی ڈگڈگی بجاتا ہے تو لفظوں کے سدھے سدھائے بندر ناچنے لگتے ہیں ۔

مولانا ابوالکلام آزاد اپنا سنِ پیدائش اس طرح بتاتے ہیں:

"یہ غریب الدّیارِ عہد، ناآشنائے عصر، بیگانۂ خویش، نمک پروردۂ ریش، خرابۂ حسرت کہ موسوم بہ احمد، مدعو بابی الکلام ۱۸۸۸ء مطابق ذوالحجہ ۱۳۰۵ھ میں ہستیِ عدم سے اس عدمِ ہستی میں وارد ہوا اور تہمتِ حیات سے متّہم ۔"

اب لوگ اس طرح نہیں لکھتے ۔ اس طرح پیدا بھی نہیں ہوتے ۔ اتنی خجالت، طوالت واذیّت تو آج کل سیزیرین پیدائش میں بھی نہیں ہوتی۔ *

---

* اسی طرح نوطرز مرصّع کا ایک جملہ ملاحظہ فرمائیے:

"جب ماہتابِ عمر میرے کا بدرجہ چہاردہ سالگی کے پہنچا، روزِ روشنِ ابتہاج اس تیرہ بخت کا تاریک تر شبِ یلدہ سے ہوا، یعنی پیمانۂ عمر و زندگانی مادر و پدرِ بزرگوار حظوظِ نفسانی سے لبریز ہو کے اسی سال دستِ قضائے دہلا"۔

کہنا صرف یہ چاہتے ہیں کہ جب میں چودہ برس کا ہوا تو ماں باپ فوت ہو گئے ۔ لیکن پیرایہ ایسا گنجلک اختیار کیا کہ والدین کے ساتھ مطلب بھی فوت ہو گیا ۔

مرزا عبدالودود بیگ نے ایسے pompous style کے لئے سبکِ ہندی کی طرز پر ایک نئی اصطلاح وضع کی ہے: طرزِ اسطوخودوس ۔ اس پر راقم الحروف کا نوٹ "دھیرج گنج کا پہلا یادگار مشاعرہ" کے باب پنجم میں ملاحظہ فرمائیے ۔ ویسے اس کے لغوی معنی ہیں: نزلے اور پاگل پن کی ایک دوا جسے اطبا دماغ کی جھاڑو کہتے ہیں ۔

کوہِ آتش فشاں میں چھلانگ

بالآخر ایک سُہانی صبح بشارت نے بقلم خود رقعہ لکھا اور رجسٹری سے بھجوا دیا ، حالانکہ مکتوب الیہ کے مکان کی دیوار ملی ہوئی تھی۔ رقعہ ۲۳ صفحات اور کم و بیش پچاس اشعار پر مشتمل تھا جن میں سے آدھے اپنے اور آدھے عندلیب شادانی کے تھے جن سے قبلہ کے برادرانہ مراسم تھے۔ اس زمانے میں رقعے زعفران سے لکھے جاتے تھے، لیکن اس رقعے کے لئے تو زعفران کا ایک کھیت بھی ناکافی ہوتا ۔ لہٰذا صرف القاب و آداب زعفران سے اور بقیہ مضمون سرخ روشنائی سے زیڈ کے موٹے نِب سے لکھا ۔ جن حصّوں پر بطورِ خاص توجّہ دلانی مقصود تھی انہیں نیلی روشنائی سے باریک حروف میں لکھا ۔ مدعا اگرچہ گستاخانہ لیکن لہجہ برابر فدویانہ اور مضمون بے حد خوشامدانہ تھا۔ قبلہ کے حسنِ اخلاق، شفقت، خوش خوئی، خوش معاملگی، صلۂ رحمی، نرم گفتاری، مردانہ وجاہت ——— مختصر یہ کہ ہر اس خوبی کی جی کھول کر تعریف کی جس کا شائبہ تک قبلہ کے کردار میں نہ تھا ۔ ساتھ ساتھ قبلہ کے دشمنوں کی نام بنام ڈٹ کر برائی کی ۔ ان کی تعداد اتنی تھی کہ ۲۳ صفحات کے کوزے میں بند کر کے کھرل کرنا انہی کا کام تھا ۔ بشارت نے جی کڑا کر کے یہ تو لکھ دیا کہ میں شادی کرنا چاہتا ہوں ، لیکن اس وضاحت کی ہمت نہ پڑی کہ کس سے ۔ مضمون بے ربط و ژولیدہ سہی لیکن قبلہ اپنے حسنِ سیرت اور دشمنوں کی حرمزدگیوں کے بیان سے بہت خوش ہوئے ۔ اس سے پہلے ان کو کسی نے وجیہہ بھی نہیں کہا تھا ۔ دو دفعہ پڑھ کر اپنے منشی کو پکڑا دیا کہ تم ہی پڑھ کر بتاؤ صاحبزادے کس سے نکاح کرنا چاہتے ہیں۔ اوصاف تو میرے بیان کئے ہیں ۔

قبلہ دیر تک اپنے مبیّنہ اوصافِ حمیدہ پر دل ہی دل میں اترایا کئے ۔ گلیشیئر تھا کہ پگھلا جا رہا تھا ۔ مسکراتے ہوئے، منشی جی سے گویا ہوئے، بعضے بعضے بے استادے شاعر کے اشعار میں کبھی کبھی الف گرتا ہے ۔ اس کے اشعار میں تو الف سے لے کر ے تک سارے حروف تہجّی ایک دوسرے پر گرے پڑ رہے ہیں ۔ جیسے عید گاہ میں نمازی ایک دوسرے کی کمر پر رکوع و سجود کر رہے ہوں ۔

بشارت کی جراتِ رندانہ کی کہانی جس نے سنی ششدر رہ گیا ۔ خیال تھا کہ کوہِ آتش فشاں پھٹ پڑے گا ۔ قبلہ نے اگر ازراہِ ترحّم سارے خاندان کو قتل نہیں کیا تو کم از کم ہر ایک کی ٹانگیں ضرور توڑ دیں گے ۔ لیکن یہ سب کچھ نہیں ہوا ۔ قبلہ نے بشارت کو اپنی غلامی میں قبول کر لیا ۔

۴

راون کیوں مارا گیا؟

قبلہ کی دکانداری اور اس کی لائی ہوئی آفتوں کی ایک مثال ہو تو بیان کریں۔ کوئی گاہک اشارۃً یا کنایۃً بھی ان کی کسی بات یا بھاؤ پر شک کرے تو پھر اس کی عزت ہی نہیں، ہاتھ پیر کی بھی خیر نہیں۔ ایک دفعہ عجلت میں تھے۔ لکڑی کی قیمت چھوٹتے ہی دس روپے بتا دی۔ دیہاتی گاہک نے پونے دس روپے لگائے اور یہ گالی دیتے ہوئے مارنے کو دوڑے کہ جٹ گنوار کو اتنی جرأت کیسے ہوئی۔ دکان میں ایک ٹوٹی ہوئی چارپائی پڑی رہتی تھی، جس کے بانوں کو چُرا چُرا کر آرا کھینچنے والے مزدور چلم میں بھر کے سُلفے کے دم لگاتے تھے۔ قبلہ جب باقاعدہ مسلّح ہو کر حملہ کرنا چاہتے تو اس چارپائی کا سیروا یعنی سرہانے کی پٹّی نکال کر اپنے دشمن یعنی گاہک پر جھپٹتے۔ اکثر سیروے کو پچکارتے ہوئے فرماتے "عجب سخت جان ہے۔ آج تک اس میں فریکچر نہیں ہوا۔ لٹھ رکھنا بزدلوں اور گنواروں کا وتیرہ ہے۔ اور لاٹھی چلانا، قصائی، کنجڑوں، غنڈوں اور پولیس کا کام ہے"۔ استعمال کے بعد سیروے کی فرسٹ ایڈ کر کے یعنی انگوچھے سے اچھی طرح جھاڑ پونچھ کر واپس جھلنگے میں لگا دیتے۔ اس طریقۂ واردات میں غالباً یہ حکمت پوشیدہ تھی کہ چارپائی تک جانے اور سیروا نکالنے کے وقفے میں اگر غصّے کو ٹھنڈا ہونا ہے تو ہو جائے۔ اور اگر ان کے معتوب کی بینائی اور عقل زائل نہیں ہوئی ہے تو وہ اپنی ٹانگوں کے استعمال میں مزید بُخل سے کام نہ لے۔ ایک قدیم چینی کہاوت ہے کہ لڑائی کے جو ۳۷۰ پینترے داناؤں نے گنوائے ہیں، ان میں جو پینترا سب سے کارآمد بتایا گیا ہے وہ یہ ہے کہ بھاگ لو! اس کی تصدیق ہندو دیومالا سے بھی ہوتی ہے۔ راون کے دس سر اور بیس ہاتھ تھے۔ پھر بھی مارا گیا۔ اس کی وجہ ہماری سمجھ میں تو یہی آتی ہے کہ بھاگنے کے لئے صرف دو ٹانگیں تھیں۔ حملہ کرنے سے پہلے قبلہ کچھ دیر خوخیاتے تاکہ مخالف اپنی جان بچانا چاہتا ہے تو بچا لے۔ فرماتے تھے، آج تک ایسا نہیں ہوا کہ کسی شخص کی ٹھکائی کرنے سے پہلے میں نے اسے گالی دے کر خبردار نہ کیا ہو۔ کیا شعر ہے وہ بھلا سا؟ ہاں!

پَشّہ سے سیکھے شیوۂ مردانگی کوئی
جب قصدِ خوں کو آئے تو پہلے پکار دے

انسانی کردار میں مچھر کی صفات پیدا کر کے اتنا فخر کرتے ہم نے انہی کو دیکھا۔ پروفیسر قاضی عبدالقدوس، ایم اے، بی ٹی نے ان کے خیالات سے متاثر ہو کر اپنے دو بقراطی لیکچروں کے

مجموعہ بعنوان "خطبات چاکسو" کی آؤٹ لائن بنائی۔ "مشرقی شعر و روایت میں پَشّہ کا مقام: تاریخی تناظر میں معروضی زاویے سے" اور "موازنۂ پَشّہ و شاہین" ہمارے قارئین ماشاءاللہ عاقل ہیں۔ اشارے کی بھی ضرورت نہیں کہ میدان کس کے ہاتھ رہا۔

ہوں لائقِ تعزیر پہ الزام غلط ہے

قبلہ کی ہیبت سب کے دلوں پر بیٹھی تھی، بجز دائیں جانب والے دکاندار کے۔ وہ قنوج کا رہنے والا، نہایت خودسر، ہتھ چھُٹ، بدمعاملہ اور بدزبان آدمی تھا۔ عمر میں قبلہ سے بیس سال کم ہو گا۔ یعنی جوان اور سرکش۔ چند سال پہلے تک اکھاڑے میں باقاعدہ زور کرتا تھا۔ پہلوان سیٹھ کہلاتا تھا۔ ایک دن ایسا ہوا کہ ایک گاہک قبلہ کی سرحد میں ۳/۴ داخل ہو چکا تھا کہ پہلوان سیٹھ اسے پکڑ کر گھسیٹتا ہوا اپنی دکان میں لے گیا اور قبلہ "مہاراج! مہاراج!" پکارتے ہی رہ گئے۔ کچھ دیر بعد وہ اس کی دکان میں گھس کر گاہک کو چھڑا کر لانے کی کوشش کر رہے تھے کہ پہلوان سیٹھ نے ان کو وہ گالی دی جو وہ خود سب کو دیا کرتے تھے۔

پھر کیا تھا۔ قبلہ نے اپنے اسلحہ خانۂ خاص یعنی چارپائی سے پٹّی نکالی اور تنگے پیر دوڑتے ہوئے اس کی دکان میں دوبارہ داخل ہوئے۔ گاہک نے بیچ بچاؤ کرانے کی کوشش کی اور اوّلین غفلت میں اپنا دانت تڑوا کر مصالحتی کارروائی سے ریٹائر ہو گیا۔ دریدہ دہن پہلوان سیٹھ دکان چھوڑ کر بگٹٹ بھاگا۔ قبلہ اس کے پیچھے سرپٹ۔ تھوڑی دور جا کر اس کا پاؤں ریل کی پٹڑی میں الجھا اور وہ منہ کے بل گرا۔ قبلہ نے جا لیا۔ پوری طاقت سے ایسا وار کیا کہ پٹّی کے دو ٹکڑے ہو گئے۔ معلوم نہیں اس سے چوٹ آئی یا ریل کی پٹڑی پر گرنے سے۔ وہ دیر تک بے ہوش پڑا رہا۔ اس کے گِرد خون کی تلیّا سی بن گئی۔

پہلوان سیٹھ کی ٹانگ کے multiple فریکچر میں گنگرین ہو گیا اور ٹانگ کاٹ دی گئی۔ فوجداری مقدمہ بن گیا۔ اس نے پولیس کو خوب پیسہ کھلایا۔ اور پولیس نے دیرینہ عداوت کی بنا پر قبلہ کا اقدامِ قتل میں چالان پیش کر دیا۔ تعزیرات ہند کی اور بہت سے دفعات بھی لگا دیں۔ لمبی چوڑی فردِ جرم سن کر قبلہ فرمانے لگے کہ ٹانگ کا نہیں، تعزیرات ہند کا ملٹی پل فریکچر ہوا ہے۔ پولیس گرفتار کر کے لے جانے لگی تو بیوی نے پوچھا "اب کیا ہوئے گا؟" کندھے اُچکاتے ہوئے بولے "دیکھیں گے۔" عدالت مجسٹریٹی میں بیچ بچاؤ کرنے والے گاہک کا دانت اور آلۂ قتل یعنی چارپائی مع خون پلائی ہوئی پٹّی کے بطور exhibits پیش

ہوئے۔ مقدمہ سیشن سپرد ہوگیا۔ قبلہ کچھ عرصے ریمانڈ پر جوڈیشل حوالات میں رہے تھے۔ اب جیل میں باقاعدہ خونیوں، ڈاکوؤں، جیب کتروں اور عادی مُجرموں کے ساتھ رہنا پڑا۔ تین چار مُچٹیوں کے بعد وہ بھی قبلہ کو اپنا چچا کہنے اور ماننے لگے۔

ان کی طرف سے، یعنی بحیثیت وکیل صفائی، کانپور کے ایک لائق بیرسٹر مصطفےٰ رضا قزلباش نے پیروی کی۔ مگر وکیل اور موکل کا کسی ایک نکتے پر بھی اتفاق رائے نہ ہو سکا۔ مثلاً قبلہ بضد تھے کہ میں حلف اٹھا کر یہ بیان دوں گا کہ مضروب نے اپنی ولدیت غلط لکھوائی ہے۔ اس کی صورت اپنے باپ سے نہیں، باپ کے ایک اوباش دوست سے ملتی ہے۔ بیرسٹر موصوف یہ موقف اختیار کرنا چاہتے تھے کہ چوٹ ریل کی پٹڑی پر گرنے سے آئی ہے، نہ کہ ملزم کی مبینہ ضرب سے۔ اُدھر قبلہ کمرۂ عدالت میں فلمی بیرسٹروں کی طرح ٹہل ٹہل کر اور کٹہرے کو جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر یہ اعلان کرنا چاہتے تھے کہ میں سپاہی بچہ ہوں۔ دکانداری میرے لئے کبھی ذریعہ عزت نہیں رہی۔ بلکہ عرصہ دراز سے ذریعہ آمدنی بھی نہیں رہی۔ ٹانگ پر وار کرنا ہماری شانِ سپہ گری اور شیوۂ مردانگی کی توہین ہے۔ میں تو دراصل اس کا سرپاش پاش کرنا چاہتا تھا۔ لہٰذا اگر مجھے سزا دینی ہی ضروری ہے تو ٹانگ توڑنے کی نہیں، غلط نشانے کی دیجیے۔ ہوں لائقِ تعزیر پہ الزام غلط ہے۔

ایّام اسیری اور جُوں کا "بلڈ ٹیسٹ"

عدالت میں فوجداری مقدمہ چل رہا تھا۔ قرائن کہتے تھے کہ سزا ہو جائے گی اور خاصی لمبی۔ گھر میں ہر پیشی کے دن رونا پیٹنا مچتا۔ اعزّہ اور احباب اپنی جگہ پریشان اور سراسیمہ کہ ذرا سی بات پر یہ نوبت آگئی۔ پولیس انہیں ہتھکڑی پہنائے سارے شہر کا چکّر دلا کر عدالت میں پیش کرتی اور پہلوان سیٹھ سے حق الخدمت وصول کرتی۔ بھولی بھالی بیوی کو یقین نہیں آتا تھا۔ ایک ایک سے پوچھتیں "بھیّا! کیا سچ مچ کی ہتھکڑی پہنائی تھی؟" عدالت کے اندر اور باہر قبلہ کے تمام دشمنوں یعنی سارے شہر کا ہجوم ہوتا۔ سارے خاندان کی ناک کٹ گئی۔ مگر قبلہ نے کبھی منہ پر تولیہ اور ہتھکڑی پر رومال نہیں ڈالا۔ گشت کے دوران مونچھوں پر تاؤ دیتے تو ہتھکڑی جھن جھن جھن جھن کرتی۔ رمضان آئے تو کسی نے مشورہ دیا کہ نماز روزہ شروع کر دیجیے۔ اپنے کان ہی پور کے * مولانا حسرت موہانی تو روزے میں چکّی بھی پیستے تھے۔ قبلہ نے

---

* کان ہی پور کے: کانپور والے اکثر "کانپور ہی کے" کہنے کے بجائے "کان ہی پور کے" کہتے ہیں!

بڑی حقارت سے جواب دیا "لاحول ولاقوۃ! میں شاعر تھوڑا ہی ہوں۔ یہ نام ہو گا غم روزگار سہ نہ سکا"۔

بیوی نے کئی مرتبہ پُچھوایا "اب کیا ہوئے گا؟"
ہر بار ایک ہی جواب ملا "دیکھ لیں گے۔"

طیش کے عالم میں جو بات منہ سے نکل جائے یا جو حرکت سرزد ہو جائے، اس پر انہیں کبھی نادم ہوتے نہیں دیکھا۔ فرماتے تھے کہ آدمی کے اصل کردار کی جھلک تو طیش کے کوندے میں ہی دکھائی دیتی ہے۔ چنانچہ اپنے کسی کرتُوت یعنی اصل کردار پر پشیمان یا پریشان ہونے کو مردوں کی شان کے خلاف سمجھتے تھے۔ ایک دن ان کا بھتیجا شام کو جیل میں کھانا اور جوئیں مارنے کی دوا دے گیا۔ دوا کے اشتہار میں لکھا تھا کہ اس کے مَلنے سے جوئیں اندھی ہو جاتی ہیں۔ پھر انہیں آسانی سے پکڑ کر مارا جا سکتا ہے۔ جُوں اور لیکھ مارنے کی مروّجہ ترکیب بھی درج تھی۔ یعنی جُوں کو بائیں ہاتھ کے انگوٹھے پر رکھو اور دائیں انگوٹھے کے ناخن سے چٹ سے کچل دو۔ اگر جُوں کے پیٹ سے کالا یا گہرا عنّابی خون نکلے تو فوراً ہماری دوا "اکسیر جالینوس" مصفّیِ خون پی کر اپنا خون صاف کیجیے۔ پرچے میں یہ ہدایت بھی تھی کہ دوا کا کورس اس وقت تک جاری رکھئے جب تک کہ جُوں کے پیٹ سے صاف شُدہ سُرخ خون نہ نکلنے لگے۔ قبلہ نے جنگلے کے اس طرف سے اشارے سے بھتیجے کو کہا کہ اپنا کان میرے منہ کے قریب لاؤ۔ پھر اس سے کہا کہ برخوردار! زندگی کا بھروسا نہیں۔ دنیا، اس جیل سمیت، سرائے فانی ہے۔ غور سے سنو۔ یہ میرا حکم بھی ہے اور وصیت بھی۔ لوہے کی الماری میں دو ہزار روپے آڑے وقت کے لئے ردّی اخباروں کے نیچے چھپا آیا تھا۔ یہ رقم نکال کر الّن (شہر کا نامی غنڈہ) کو دے دینا۔ اپنی چچی کو میری طرف سے دلاسا دینا۔ الّن کو میری دعا کہنا اور یہ کہنا کہ ان چھوؤں کی ایسی ٹُھکائی کرے کہ گھر والے صورت نہ پہچان سکیں۔ یہ کہہ کر اخبار کا ایک مسلا ہوا پُرزہ بھتیجے کو تھما دیا، جس کے حاشیے پر ان چھ گواہان استغاثہ کے نام درج تھے، جن کو پِٹوانے کا انہوں نے جیل میں اس وقت منصوبہ بنایا تھا جب ایسی ہی حرکت پر انہیں آج کل میں سزا ہونے والی تھی۔

ایک دفعہ اتوار کو ان کا بھتیجا جیل میں ملاقات کو آیا اور ان سے کہا کہ جیلر تک بآسانی سفارش پہنچائی جا سکتی ہے۔ اگر آپ کا جی کسی خاص کھانے مثلاً زردہ یا دہی بڑے، شوق کی مثنوی، سگرٹ یا مہوے کے پان کو چاہے تو چوری چھپے ہفتے میں کم از کم ایک بار آسانی سے پہنچایا جا سکتا ہے۔ چچی نے تاکید سے کہا ہے۔ عید نزدیک آ رہی ہے۔ رو رو کر آنکھیں سُجالی ہیں۔

قبلہ نے جیل کے کھدر کے نیکر پر دوڑتا ہوا کھٹمل پکڑتے ہوئے کہا، مجھے قطعی کسی چیز کی حاجت نہیں۔ اگلی دفعہ آؤ تو سراج فوٹوگرافر سے حویلی کا فوٹو کھنچوا کے لے آنا۔ کئی مہینے ہو گئے دیکھے ہوئے۔ جدھر تمہاری چچی کے کمرے کی چق ہے، اس رخ سے کھینچے تو اچھی آئے گی۔

سنتری نے زمین پر زور سے بُوٹ کی تھاپ لگاتے اور تھری ناٹ تھری رائفل کا کندہ بجاتے ہوئے ڈپٹ کر کہا کہ ملاقات کا وقت ختم ہو چکا۔ عید کا خیال کر کے بھتیجے کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں اور اس نے نظریں نیچی کر لیں۔ اس کے ہونٹ کانپ رہے تھے۔ قبلہ نے اس کا کان پکڑا اور کھینچ کر اپنے منہ تک لانے کے بعد کہا، ہاں! ہو سکے تو جلد ایک تیز چاقو، کم از کم چھ انچ کے پھل والا، ڈبل روٹی یا عید کی سوئیوں میں چھپا کر بھجوا دو۔ دوم، بمبئی میں Pentangular* شروع ہونے والا ہے۔ کسی ترکیب سے مجھے روزانہ اسکور معلوم ہو جائے تو واللہ! ہر روز روزِ عید ہو، ہر شب شبِ برات! خصوصاً وزیر علی کا اسکور دن کے دن معلوم ہو جائے تو کیا کہنا۔

سزا ہو گئی۔ ڈیڑھ سال قید بامشقت۔ فیصلہ سنا۔ سر اٹھا کر اوپر دیکھا۔ گویا آسمان سے پوچھ رہے ہوں "تو دیکھ رہا ہے! یہ کیا ہو رہا ہے؟ How's that?" پولیس نے ہتھکڑی ڈالی۔ قبلہ نے کسی قسم کے ردِّعمل کا اظہار نہیں کیا۔ جیل جاتے وقت بیوی کو کہلا بھیجا کہ آج میرے جدِّ اعلیٰ کی روح پُر فتوح کتنی مسرور ہو گی۔ کتنی خوش نصیب بی بی ہو تم کہ تمہارا دُولہا (جی ہاں! یہی لفظ استعمال کیا تھا) ایک حرامزادے کی ٹھکائی کر کے مردوں کا زیور پہنے، جیل جا رہا ہے۔ لکڑی کی ٹانگ لگوا کر گھر نہیں آ رہا۔ دو رکعت نماز شکرانے کی پڑھنا۔ بھتیجے کو تاکید کی کہ حویلی کی مرمت کراتے رہنا۔ اپنی چچی کا خیال رکھنا۔ ان سے کہنا، یہ دن بھی گزر جائیں گے۔ دل بھاری نہ کریں اور جمعہ کو کاسنی دوپٹا اوڑھنا نہ چھوڑیں۔

بیوی نے پُچھوایا، اب کیا ہوئے گا؟
جواب ملا، دیکھا جائے گا۔

ٹارزن کی واپسی

دو سال تک دکان میں تالا پڑا رہا۔ لوگوں کا خیال تھا کہ جیل سے چھوٹنے کے بعد چُپ

---

* Pentangular: بمبئی میں سالانہ کرکٹ ٹورنامنٹ ہوتا تھا، جس میں ہندو، مسلم، پارسی، اینگلو انڈین اور یوروپین ٹیمیں حصہ لیتی تھیں۔

چُپاتے کہیں اور چلے جائیں گے۔ قبلہ جیل سے چھوٹے۔ ذرا جو بدلے ہوں۔ ان کی ریڑھ کی ہڈی میں جوڑ نہیں تھے۔ جاپانی زبان میں کہاوت ہے کہ بندر درخت سے زمین پر گر پڑے ، پھر بھی بندر ہی رہتا ہے۔ سو وہ بھی ٹارزن کی طرح !AAuuaauuuu چنگھاڑتے جیل سے نکلے۔ سیدھے اپنے آبائی قبرستان گئے۔ والد کی قبر کی پائینتی کی خاک سر پر ڈالی ۔ فاتحہ پڑھی اور کچھ سوچ کر مسکرا دیے ۔ دوسرے دن دکان کھولی ۔ کیبن کے باہر ایک بلّی گاڑ کر اس پر ایک لکڑی کی ٹانگ بڑھئی سے بنوا کر لٹکا دی ۔ صبح و شام اس کو رسّی سے کھینچ کر اس طرح چڑھاتے اور اتارتے تھے جس طرح اس زمانے میں چھاؤنیوں میں یونین جیک چڑھایا اتارا جاتا تھا۔ جن نادہندوں نے دو سال سے رقم دبا رکھی تھی انہیں یاد دہانی کے دھمکی آمیز خطوط لکھے ۔ اور اپنے دستخطوں کے بعد بریکٹ میں (سزایافتہ) لکھا ۔ جیل جانے سے پہلے خطوط میں خود کو بڑے فخر سے "تنگِ اسلاف" لکھا کرتے تھے ۔ کسی کی مجال نہ تھی کہ اس سے اتفاق کرے ۔ اتفاق تو درکنار ، مارے ڈر کے اختلاف بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اب اپنے نام کے ساتھ تنگِ اسلاف کے بجائے "سزایافتہ" اس طرح لکھنے لگے جیسے لوگ ڈگریاں یا خطاب لکھتے ہیں۔ قانون اور جیل سے ان کی جھجک نکل چکی تھی ۔

تو قبلہ جیسے گئے تھے ویسے ہی جیل کاٹ کر واپس آ گئے ۔ طنطنے اور آواز کے کڑکے میں ذرا فرق نہ آیا ۔ اس اثنا میں اگر زمانہ بدل گیا تو اس میں ان کا کوئی قصور نہ تھا۔ اب ان کی رائے میں قطعیت کے علاوہ فقطیت بھی پیدا ہو گئی ۔ ان کا فرمایا ہوا مستند تو پہلے ہی تھا ، اب مختتم بھی ہو گیا۔ سیاہ مخمل کی رامپوری ٹوپی اور زیادہ ترچھی ہو گئی ۔ یعنی اتنی جھکا کر ٹیڑھی اوڑھنے لگے کہ دائیں آنکھ ٹھیک سے نہیں کھول سکتے تھے ۔ اب کبھی بیوی گھبرا کے "اب کیا ہوئے گا؟" کہتیں تو وہ "دیکھتے ہیں" کے بجائے "دیکھ لیں گے" اور "دیکھتی جاؤ" کہنے لگے ۔ رہائی کے دن نزدیک آئے تو داڑھی کے علاقے کے بال بھی کچھے دار مونچھوں میں شامل کر لئے جو اب اتنی گھنی ہو گئی تھیں کہ ایک ہاتھ سے پکڑ کر انہیں اٹھاتے ، تب کہیں دوسرے ہاتھ سے منہ میں لقمہ رکھ پاتے تھے ۔ جیل ان کا کچھ بگاڑ نہ سکی ۔ فرماتے تھے "یہیں تیسری بیرک میں ایک منشی فاضل پاس جعلیا ہے ۔ فصاحت یار خاں ۔ غبن اور دھوکہ دہی میں تین سال کی کاٹ رہا ہے ۔ بامشقّت ۔ پہلے شُعلہ ، اب حزیں تخلّص کرتا ہے ۔ بلا کا بسیار گو ۔ چکّی پیستے میں اپنی ہی تازہ غزل گاتا رہتا ہے ۔ موٹا پیستا ہے اور پِٹتا ہے ۔ اب یہ کوئی شاعری تو ہے نہیں ۔ تِس پر خود کو غالب سے کم نہیں سمجھتا ۔ حالاں کہ مماثلت صرف اتنی ہے کہ دونوں نے جیل کی ہوا

کھائی ۔ خود کو روہیلہ بتاتا ہے ۔ ہو گا ۔ لگتا نہیں ۔ قیدیوں سے بھی منہ چھپائے پھرتا ہے ۔ اپنے بیٹے کو ہدایت کر رکھی ہے کہ میرے بارے میں کوئی پوچھے تو کہہ دینا کہ والد صاحب عارضی طور پر نقل مکانی کر گئے ہیں ۔ جیل کو کبھی جیل نہیں کہتا۔ زنداں کہتا ہے ۔ اور خود کو قیدی کے بجائے اَسیر! ارے صاحب! غنیمت ہے جیلر کو عزیزِ مصر نہیں کہتا۔ اسے تو چکّی کو آسیا کہنے میں بھی عار نہ ہوتی ، مگر میں تو جانوں پاٹ کی عربی معلوم نہیں ۔ شاید وہ سمجھتا ہے کہ استفراغ اور اسہال کہنے سے قے دست تو بند نہیں ہوتے ، بدبُو جاتی رہتی ہے ۔ ٹھیک ہی سمجھتا ہے ۔ کس واسطے کہ اس کے باپ کا انتقال ہیضے میں ہوا تھا۔ ارے صاحب! میں یہاں کسی کی جیب کاٹ کے تھوڑا ہی آیا ہوں ۔ شیر کو پنجرے میں قید کر دو، تب بھی شیر ہی رہتا ہے ۔ گیدڑ کو کچھار میں آزاد چھوڑ دو ، اور زیادہ گیدڑ ہو جائے گا۔ اب ہم ایسے بھی گئے گزرے نہیں کہ جیل کا گھٹنا (گھٹنوں تک نیکر) پہنتے ہی طبیعت میں سوز و گداز پیدا ہو جائے"۔ بلکہ ہمیں تو قبلہ کی باتوں سے ایسا لگتا تھا کہ پھٹا ہوا کپڑا پہننے اور جیل میں قیام فرمانے کو سنّتِ یوسفی سمجھتے ہیں ۔ ان کے مزاج میں جو ٹیڑھ تھی وہ کچھ اور بڑھ گئی ۔ کوّے پر کتنے ہی صدمے گزر جائیں ، کتنا ہی بوڑھا ہو جائے ، اس کے پر و بال کالے ہی رہتے ہیں ۔ اَکل کُھرے ، کُھرّے ، کُھردرے کھرے یا کھوٹے ، وہ جیسے کچھ بھی تھے ، ان کا ظاہر و باطن ایک تھا ۔

تن اُجرا (اُجلا) من کادلا (گدلا) بگلا جیسے بھیس
ایسے سے کاگا بھلے ، باہر بھیتر ایک

فرماتے تھے ، الحمدللہ! میں مُنافق ، ریاکار نہیں ۔ میں نے گناہ کو ہمیشہ گناہ سمجھ کر کیا۔

دکان دو سال سے بند پڑی تھی ۔ چھوٹ کر گھر آئے تو بیوی نے پوچھا:

"اب کیا ہوئے گا ؟"
"بیوی، ذرا تم دیکھتی جاؤ۔"

"لبِ معشوق"

اب کے دکان چلی اور ایسی چلی کہ اوروں ہی کو نہیں خود انہیں بھی حیرت ہوئی ۔ دکان کے باہر اسی شکار گاہ یعنی کیبن میں اسی ٹھنے سے گاؤ تکیے کی ٹیک لگا کر بیٹھتے ۔ مگر زاویہ پسر گیا تھا۔ پیروں کا رُخ اب فرش کی بہ نسبت آسمان کی طرف زیادہ تھا ۔ جیل میں سکونت پذیر ہونے سے پہلے قبلہ گاہک کو ہاتھ کے مُلتجیانہ اشارے سے بلایا کرتے تھے ۔ اب صرف انگشتِ شہادت

کے خفیف سے اشارے سے طلب کرنے لگے ۔ انگلی کو اس طرح حرکت دیتے جیسے ڈانواں ڈول پتنگ کو ٹھمکی دے کر اس کا قبلہ درست کر رہے ہوں ۔ حقّے کی نَے میں اب ایک فُٹ کا اضافہ کر لیا۔ حقّہ اب پیتے کم، گُڑگُڑاتے زیادہ تھے۔ بدبودار دھوئیں کا چھلّا اس طرح چھوڑتے کہ گاہک کی ناک میں تتھ کی طرح لٹک جاتا ۔ اکثر فرماتے "واجد علی شاہ ، جان عالم پیانے ، جو خوبصورت نام رکھنے میں اپنا ثانی نہ رکھتے تھے ، حقّے کا کیسا پیارا نام رکھا تھا ۔۔۔ لبِ معشوق! جو شخص کبھی حقّے کے پاس سے بھی گزرا ہے ، وہ بخوبی اندازہ لگا سکتا ہے کہ جان عالم پیا کا پالا کیسے لبوں سے پڑا ہو گا ۔ چنانچہ معزولی کے بعد وہ فقط حقّہ اپنے ہمراہ مٹیا برج لے گئے ۔ پری خانے کے تمام معشوق لکھنؤ میں ہی چھوڑ گئے ۔ اس لئے کہ معشوق کو نیچہ پکڑ کے گُڑگُڑایا نہیں جا سکتا ۔

"بلّی پہ لٹکا دوں گا"

منشی دیا نرائن نگم کے رسالے "زمانہ" کے کاتب سے عرفی کا مشہور شعر احاطے کی دیوار پر ڈامر سے لکھوا دیا:

عُرفی تو میندیش زغوغائے رقیباں
آوازِ سگاں کم نہ کند رزقِ گدا را *

ہمیں اس شعر سے نسلی عصبیت اور جانبداری کی بُو آتی ہے۔ کتّے اگر شعر کہہ سکتے تو دوسرا مصرع کچھ یوں ہوتا:

آوازِ گدا کم نہ کُند رزقِ سگاں را (+)

کچھ دن بعد ان کا لنگڑا دشمن یعنی پہلوان سیٹھ دکان بڑھا کر کہیں اور چلا گیا۔ قبلہ بات بے بات ہر ایک کو دھمکی دینے لگے کہ سالے کو بلّی پہ لٹکا دوں گا۔ ہیبت کا یہ عالم کہ اشارہ تو بہت بعد کی بات ہے، قبلہ جس گاہک کی طرف نگاہ اٹھا کر بھی دیکھ لیں، اسے کوئی دوسرا نہیں بُلاتا تھا۔ اگر وہ از خود دوسری دکان میں چلا بھی جائے تو دکاندار اسے لکڑی نہیں دکھاتا تھا۔ ایک دفعہ ایسا بھی ہوا کہ سڑک پر یوں ہی کوئی راہ گیر منہ اٹھائے جا رہا تھا کہ قبلہ نے اسے انگلی سے اندر آنے کا

---

* مطلب یہ کہ عُرفی تو رقیبوں کے شور و غوغا کرنے سے اندیشے میں مبتلا نہ ہو۔ کتّوں کے بھونکنے سے گدا کا رزق کم نہیں ہوتا۔

(+) گدا کی صدا سے کتّوں کا رزق کم نہیں ہوتا۔

اشارہ کیا۔ جس دکان کے سامنے سے وہ گزر رہا تھا، اس کا مالک اور مُنیم اسے گھسیٹتے ہوئے قبلہ کی دکان میں اندر دھکیل گئے۔ اس نے قبلہ سے روہانسا ہو کر کہا کہ میں تو مُول گنج پتنگوں کے پیچ دیکھنے جا رہا تھا!

۵

وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ شجر تو نہیں

پھر یکایک ان کا کاروبار ٹھپ ہو گیا۔ وہ کٹّر مسلم لیگی تھے۔ اس کا اثر ان کی بزنس پر پڑا۔ پھر پاکستان بن گیا۔ انہوں نے اپنے نعرے کو حقیقت بنتے دیکھا۔ اور دونوں کی پوری قیمت ادا کی۔ کاہکوں نے آنکھیں پھیر لیں۔ لکڑمنڈی کے چوہے شیر ہو گئے۔ عزیز و اقارب، جن سے وہ تمام عمر لڑتے جھگڑتے اور نفرت کرتے رہے، ایک ایک کر کے پاکستان چلے گئے تو ایک جھٹکے کے ساتھ یہ انکشاف ہوا کہ وہ ان نفرتوں کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے۔ اور جب اکلوتی بیٹی اور داماد بھی اپنی دکان بیچ کھوچ کے کراچی سِدھارے تو انہوں نے بھی اپنے خیمے کی طنابیں کاٹ ڈالیں۔ دکان اونے پونے ایک دلال کے ہاتھ بیچی۔ لوگوں کا کہنا تھا کہ "بے نامی" سودا ہے۔ دلال کی آڑ میں دکان دراصل اسی لنگڑے پہلوان سیٹھ نے خرید کر ان کی ناک کاٹی ہے۔ خفیف سا شبہ تو قبلہ کو بھی ہوا تھا، مگر "اپنی بلا سے بُوم بسے یا ہُمار ہے" والی صورت حال تھی۔ ایک ہی جھٹکے میں پیڑھیوں کے رشتے ناتے ٹوٹ گئے اور قبلہ نے پُرکھوں کی جنم بُھوم چھوڑ کر اُن کے خوابوں کی سرزمین کا رخ کیا۔

ساری عمر شیش محل میں اپنی مور پنکھ انا کا ناچ دیکھتے دیکھتے، قبلہ ہجرت کر کے کراچی آئے تو نہ صرف زمین اجنبی لگی، بلکہ اپنے پیروں پر نظر پڑی تو وہ بھی کسی اور کے لگے۔ کھولنے کو تو لی مارکٹ میں ہرچند رائے روڈ پر نشتم پشتم دکان کھول لی، مگر بات نہیں بنی۔ گجراتی میں مثل ہے کہ پرانے مٹکے پر نیا منہ نہیں چڑھایا جا سکتا۔ آنے کو تو وہ ایک نئی سرسبز سرزمین میں آ گئے، مگر ان کی بوڑھی آنکھیں پِلکھن کو ڈھونڈتی رہیں۔ پِلکھن تو درکنار، انہیں تو کراچی میں نیم تک نظر نہ آیا۔ لوگ جسے نیم بتاتے تھے وہ دراصل بکائن تھی جس کی 'نبولی' کو لکھنؤ میں حکیم صاحب عالم، پیچش اور بواسیر کے نسخوں میں لکھا کرتے تھے۔

کہاں کانپور کے دیہاتی گاہک، کہاں کراچی کے نخریل ساگوان خریدنے والے۔ درحقیقت انہیں جس بات سے سب سے زیادہ تکلیف ہوئی وہ یہ تھی کہ یہاں اپنے قرب و جوار میں، یعنی اپنے سایۂ زحمت میں ایک شخص بھی ایسا نظر نہیں آیا جسے وہ بے وجہ و بے خطر گالی دے سکیں۔ ایک دن کہنے لگے "یہاں تو بڑھئی آری کا کام زبان سے لیتا ہے۔ چار پانچ دن ہوئے۔ ایک دریدہ دہن بڑھئی آیا۔ اقبال مسیح نام تھا۔ میں نے کہا، ابے! پرے ہٹ کر کھڑا ہو۔ کہنے لگا، حضرت عیسیٰ بھی تو ترکھان تھے۔ میں نے کہا، کیا کُفر بکتا ہے؟ ابھی بَلّی پہ لٹکا دوں گا۔ کہنے لگا، اوہ لوک وی ایہی کہیندے ساں! (وہ لوگ بھی حضرت عیسیٰ سے یہی کہتے تھے!)

میر تقی میر کراچی میں

پہلی نظر میں انہوں نے کراچی کو اور کراچی نے ان کو مُسترد کر دیا۔ اٹھتے بیٹھتے کراچی میں کیڑے ڈالتے۔ شکایت کا انداز کچھ ایسا ہوتا تھا:

"حضت! یہ مچھر ہیں یا مگر مچھر؟ کراچی کا مچھر ڈی ڈی ٹی سے بھی نہیں مرتا۔ صرف قوّالوں کی تالیوں سے مرتا ہے۔ یا غلطی سے کسی شاعر کو کاٹ لے تو باؤلا ہو کر بے اولاد امرتا ہے۔ نمرود مردود کی موت ناک میں مچھر گھسنے سے واقع ہوئی تھی۔ کراچی کے مچھروں کا شجرۂ نسب کئی نمرودوں کے واسطے سے اسی مچھر سے جا ملتا ہے۔ اور ذرا زبان تو ملاحظہ فرمائیے۔ میں نے پہلی مرتبہ ایک صاحب کو پٹّے والے کو پکارتے سنا تو میں سمجھا اپنے کتّے کو بلا رہے ہیں۔ معلوم ہوا یہاں چپراسی کو پٹّے والا کہتے ہیں۔ ہر وقت کچھ نہ کچھ پھڈّا اور لفڑا ہوتا رہتا ہے۔ ٹوکو تو کہتے ہیں، اردو میں اس صورتحال کے لئے کوئی لفظ نہیں ہے۔ بھائی میرے! اردو میں یہ صورتِ حال بھی تو نہیں ہے۔ بمبئی والے لفظ اور صورت حال دونوں اپنے ساتھ لائے ہیں۔ میر تقی میر اونٹ گاڑی میں منہ باندھے بیٹھے رہے۔ اپنے ہم سفر سے اس لئے بات نہ کی کہ "زبانِ غیر سے اپنی زباں بگڑتی ہے"۔ میر صاحب کراچی میں ہوتے تو بخدا ساری عمر منہ پر ڈھاٹا باندھے پھرتے، یہاں تک کہ ڈاکوؤں کا سا بھیس بنائے پھرنے پر کسی ڈکیتی میں دھر لئے جاتے۔ اماں! ٹونک والوں کو امرود کو صفری کہتے تو ہم نے بھی سنا تھا۔ یہاں امرود کو جام کہتے ہیں۔ اور اس پر نمک مرچ کے بجائے 'صاحب' لگا دیں تو مُراد نواب صاحب لسبیلہ ہوتے ہیں۔ اپنی طرف وکٹوریہ کا مطلب ملکہ ٹوریہ ہوتا تھا۔ یہاں کسی ترکیب سے دس بارہ جنے ایک گھوڑے پر سواری گانٹھ لیں تو اسے وکٹوریہ کہتے ہیں۔ میں دو دن لاہور رکا تھا۔ وہاں دیکھا کہ جس بازار میں کوئلوں سے منہ کالا کیا جاتا ہے، وہ ہیرا منڈی کہلاتی ہے! اب یہاں نیا فیشن چل پڑا ہے۔ گانے والے کو گلوکار اور لکھنے والے کو قلم کار کہنے

لگے ہیں۔ میاں! ہمارے وقتوں میں تو صرف نیکو کار اور بد کار ہوا کرتے تھے۔ قلم اور گلے سے یہ کام نہیں لیا جاتا تھا۔

"میں نے لالوکھیت، بہار کالونی، چاکی واڑہ اور گولیمار کا چپہ چپہ دیکھا ہے۔ چودہ پندرہ لاکھ آدمی (اخبار والے اب آدمی کو آدمی کہنے سے شرماتے ہیں۔ افراد اور نفوس کہتے ہیں!) ضرور رہتے ہوں گے۔ لیکن کہیں کتابوں اور عطریات کی دکان نہ دیکھی۔ کاغذ تک کے پھول نظر نہ آئے۔ کانپور میں ہم جیسے شرفا کے گھروں میں کہیں نہ کہیں موتیا کی بیل ضرور چڑھی ہوتی تھی۔ حضور والا! یہاں موتیا صرف آنکھوں میں اترتا ہے! حد ہو گئی، کراچی میں لکھ پتی، کروڑ پتی سیٹھ لکڑی اس طرح نپواتا ہے گویا کم خواب کا پارچہ خرید رہا ہے۔ لکڑی دن میں دو فٹ بکتی ہے اور بُرادہ خریدنے والے پچاس! میں نے برسوں اُپلوں پر پکایا ہوا کھانا بھی کھایا ہے۔ لیکن بُرادے کی انگیٹھی پر جو کھانا پکے گا وہ صرف دوزخی مُردوں کے چالیسویں کے لئے مناسب ہے۔

"بھرپائے ایسی بزنس سے! مانا کہ روپیہ بہت کچھ ہوتا ہے، مگر سبھی کچھ تو نہیں۔ زر کو حاجت روا کرنے والا، قاضی الحاجات کہا گیا ہے۔ تسلیم۔ مگر جب یہ خود سب سے بڑی حاجت بن جائے تو وہ صرف موت سے رفع ہوگی۔ میں نے تو زندگی میں ایسی کانی کُھتری لکڑی نہیں بیچی۔ نہ فروختنی، نہ سوختنی۔ بڑھئی کی یہ مجال کہ چھاتی پہ چڑھ کے کمیشن مانگے۔ نہ دو تو مال کو گندے انڈے کی طرح قیامت تک سیتے رہو۔ ہائے! نہ ہوا کانپور! بسولے سے سالے کی ناک اتار کر ہتھیلی پر رکھ دیتا کہ جا! اپنی جُرو اکو دین مہر میں دے دینا! واللہ! یہاں کا تو باوا آدم ہی نرالا ہے۔ سنتا ہوں یہاں کے بازارِ حسن نیپیئر روڈ اور جاپانی روڈ پر شب زادیاں اپنے اپنے درشن دریچوں میں لال بتّیاں جلتے ہی خنجراب چھاتیوں کے خوانچے لگا کر بیٹھ جاتی ہیں۔ فلموں میں بھی اشرف المعلقات ہی کی نمائش ہوتی ہے۔ یہ تو وہی مثل ہوئی کہ اوچھے کے گھر تیتر، باہر باندھوں کہ بھیتر۔ جمہوریہ اسلامیہ کی سرکارِ بے سروکار کچھ نہیں کہتی۔ لیکن کسی طوائف کو شادی بیاہ میں مُجرے کے لئے بلانا ہو تو پہلے اس کی اطلاع تھانہ متعلقہ کو دینی پڑتی ہے! رنڈی کو پرمٹ راشن کارڈ پہ ملتے ہم نے یہیں دیکھا۔ نقدِ عیش عند الطلب نہ ملا تو کس کام کا۔ درشنی منڈیوں میں درشنی ہُنڈیوں کا کیا کام"۔

مرزا عبدالودود بیگ اس صورتِ حال کی کچھ اور ہی تاویل کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ طوائف کو تھانے سے NOC (نو ابجکشن سرٹیفکٹ) اس لئے لینا پڑتا ہے کہ پولیس پوری طرح اطمینان کر لے کہ وہ اپنے دھندے پر ہی جا رہی ہے۔ وعظ سننے یا سیاست میں حصہ لینے نہیں جا

رہی۔

ایک دن قبلہ فرمانے لگے "ابھی کچھ دن ہوئے۔ کراچی کی ایک نامی گرامی طوائف کا گانا سننے کا اتفاق ہوا۔ اماں! اس کا تلفظ تو چال چلن سے بھی زیادہ خراب نکلا۔ ہائے! ایک زمانہ تھا کہ شرفا اپنے بچوں کو ادب آداب سیکھنے کے لئے چوک کی طوائفوں کے کوٹھوں پر بھیجتے تھے"۔

اس باب میں بھی مرزا سُوءظن سے کام لیتے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ طوائفوں کے کوٹھوں پر تو اس لئے بھیجتے تھے کہ بزرگوں کی صحبت اور گھر کے ماحول سے بچے رہیں!

دوڑتا ہوا درخت

کراچی شہر انہیں کسی طور اور کسی طرف سے اچھا نہیں لگا۔ جھنجھلا کر بار بار کہتے "اماں! یہ شہر ہے یا جہنم؟" مرزا کسی دانا کے قول میں تصرفِ بیجا کر کے فرماتے ہیں کہ قبلہ اس دار المحن سے کوچ فرمانے کے بعد اگر خدانخواستہ وہیں پہنچ گئے جس سے کراچی کو تشبیہ دیا کرتے تھے تو چاروں طرف نظر دوڑانے کے بعد یہی ارشاد ہو گا کہ ہم نے تو سوچا تھا کراچی چھوٹا سا جہنم ہے۔ جہنم تو بڑا سا کراچی نکلا!

ایک دفعہ ان کے ایک بے تکلف دوست نے ان سے کہا کہ "تمہیں معاشرے میں خرابیاں ہی خرابیاں نظر آتی ہیں تو بیٹھے بیٹھے ان پر کُڑھنے کے بجائے ان کی اصلاح کی فکر کرو۔"

ارشاد فرمایا "سنو! میں نے ایک زمانے میں پی ڈبلیو ڈی کے کام بھی کئے ہیں، مگر دوزخ کی ایئر کنڈیشننگ کا ٹھیکہ نہیں لے سکتا"۔

بات صرف اتنی تھی کہ اپنی چھاپ، تِلک اور چھب چھنوانے سے پہلے وہ جس آئینے میں خود کو دیکھ دیکھ کر ساری عمر اترایا کئے، اس میں جب نئی دنیا اور نئے وطن کو دیکھا تو وہ امتدادِ زمانہ سے * distorting mirror بن چکا تھا جس میں ہر شکل اپنا ہی منہ چِڑاتی نظر آتی تھی۔

ان کے کاروباری حالات تیزی سے بگڑ رہے تھے۔ بزنس نہ ہونے کے برابر تھی۔ ان کی دکان کی دیوار پر ایک تازہ وصلی آویزاں دیکھ کر ہمیں بڑا دکھ ہوا:

---

* ہم نے کہیں اور اس کا ترجمہ "مسخائینہ" کیا ہے۔ یعنی وہ آئینہ جس کا کام ہی شکل کو مسخ کرنا اور مضحکہ خیز بنانا ہے۔

نہ پوچھ حال مرا، چوبِ خشکِ صحرا ہوں
لگا کے آگ جسے کارواں روانہ ہوا

ہم نے ان کا دل بڑھانے کے لئے کہا، آپ کو چوبِ خشک کون کہہ سکتا ہے؟ آپ کی جواں ہمتی اور مستعدی پر ہمیں تو رشک آتا ہے۔ خلافِ معمول مسکرائے۔ جب سے ڈینچرز ٹوٹے، منہ پہ رومال رکھ کر ہنسنے لگے تھے۔ کہنے لگے۔ "ہاں میاں! آپ جوان آدمی ہیں۔ اپنا تو یہ احوال ہوا کہ

"منفعل" ہو گئے قویٰ غالب
اب عناصر میں "ابتذال" کہاں

پھر منہ سے رومال ہٹاتے ہوئے کہا "برخوردار! میں وہ درخت ہوں جو ٹرین میں جاتے ہوئے مسافر کو دوڑتا ہوا نظر آتا ہے"۔

میرے ہی من کا مجھ پر دھاوا

یوں وہ حتی الامکان اپنے غصّے کو کم نہیں ہونے دیتے تھے۔ کہتے تھے، میں ایسی جگہ ایک منٹ بھی نہیں رہنا چاہتا جہاں آدمی کسی پر غصّہ ہی نہ ہو سکے۔ اور جب انہیں ایسی ہی جگہ رہنا پڑا تو وہ زندگی میں پہلی بار اپنے آپ سے رُوٹھے۔ اب وہ آپ ہی آپ کُڑھتے، اندر ہی اندر کھولتے، جلتے، سُلگتے رہتے:

میرے ہی من کا مجھ پر دھاوا
میں ہی اگنی، میں ہی ایندھن

انہی کا قول ہے کہ یاد رکھو، غصّہ جتنا کم ہو گا، اس کی جگہ اُداسی لیتی چلی جائے گی۔ اور یہ بڑی بُزدلی کی بات ہے۔ بُزدلی کے ایسے ہی اداس لمحوں میں اب انہیں اپنا آبائی گاؤں جہاں بچپن گزرا تھا، بے تحاشا یاد آنے لگتا۔ واماندگیِ زیست نے ماضی میں اپنی پناہیں تراش لیں۔ گویا البم کھل گیا۔ دُھندلاتے سیپیا رنگ کی تصویریں چشمِ تصور کے سامنے بکھرتی چلی جاتیں۔ ہر تصویر کے ساتھ زمانے کا ورق الٹتا چلا گیا۔ ہر اسنیپ شاٹ کی اپنی ایک کہانی تھی: دُھوپ میں ابرق کے ذرّوں سے چِلکتی کچّی سڑک پر گھوڑوں کے پسینے کی نرمہکار۔ بھیڑ کے نوزائیدہ بچے کو گلے میں مفلر کی طرح ڈالے شام کو خوش خوش لوٹتے کسان۔ چلمنوں کے پیچھے بارسنگھار کے پھولوں سے رنگے ہوئے دوپٹے۔ ارہر کے ہرے بھرے کھیت میں پگڈنڈی کی مانگ۔ خشک سالی میں ساون کے تھوتھے بادلوں کو رہ رہ کر تکتی نرآس آنکھیں۔ جاڑے کی اجاڑ راتوں میں

ٹھٹھرتے گیدڑوں کی منحوس آوازیں ۔ چراغ جلے باڑے میں لوٹتی گایوں کے گلے میں بجتی ہوئی گھنٹیاں ۔ کالی بھنور رات میں چوپال کی جلتی بجھتی گشتی چلم پر طویل سے طویل تر ہوتے ہوئے کش ۔ موتیا کے گجروں کی لپٹ کے ساتھ کنوارے پِنڈے کی بگولا مہکار ۔ ڈوبتے سورج کی زرد روشنی میں تازہ قبر پر جلتی ہوئی اگر بتّی کا بل کھاتا دھواں ۔ دہکتی بالُو میں تڑختے چنوں کی سوندھی لپٹ سے پھڑکتے ہوئے تتھنے ۔ میونسپلٹی کی مٹّی کے تیل کی لالٹین کا بھبکا ۔ یہ تھی ان کے گاؤں کی سَت سُگند ۔ یہ ان کے اپنے نافۂ ماضی کی مہکار تھی جو یادوں کے دشت میں دوانی پھرتی تھی ۔

اولتی کی ٹپاٹپ

ستّر سالہ بچّے کے ذہن میں تصویریں گڈمڈ ہونے لگتیں ۔ خوشبوئیں ، نرماہٹیں اور آوازیں بھی تصویر بن بن کر اُبھرتیں ۔ اسے اپنے گاؤں میں مینہ برسنے کی ایک ایک آواز الگ سنائی دیتی ۔ ٹین کی چھت پر تڑتڑ بجتے ہوئے تاشے ۔ سوکھے پتّوں پر کراری بوندوں کا شور ۔ پکّے فرش پر جہاں اُنگل بھر پانی کھڑا ہو جاتا ، وہاں موٹی بوند گرتی تو ایک موتیوں کا تاج سا ہوا میں اُچھل پڑتا ۔ تپتی کھپریلوں پر اُڑتی بدلی کے جھالے کی سنسناہٹ ۔ گرمی دانوں سے اُپڑے بالک بدن پر برکھا کی پہلی پھوار ، جیسے کسی نے منتھول میں نہلا دیا ہو ۔ جوان بیٹے کی قبر پر پہلی بارش اور ماں کا تنگے سر آنگن میں آ آکر آسمان کی طرف دیکھنا ۔ پھبک اٹھنے کے لئے تیار مٹّی پر ٹوٹ کے برسنے والے بادل کی ہراول گرم لپٹ ۔ ڈھولک پر ساون کے گیت کی تال پر بجتی چوڑیاں اور بے تال قہقہے ۔ سُوکھے تالاب کے پیندے کی چکنی مٹّی میں پڑی ہوئی دراڑوں کے لوزاتی جال میں ترسا ترسا کر برسنے والی بارش کے سرسراتے ریلے ۔ تھونی سے لٹکی ہوئی لالٹین کے سامنے ، تا حدِ روشنی ، موتیوں کی رِم جھم جھالر ، ہمک ہمک کر پرائے آنگن میں گرتے پرنالے ۔ آموں کے پتّوں پر مجیرے بجاتی نرسل بوچھار ۔ اور جُھولوں پر پینگیں لیتی دوشیزائیں ۔

اور پھر رات کے سنّاٹے میں ، پانی تھمنے کے بعد ، سوتے جاگتے میں ، اولتی * کی ٹپاٹپ!

---

* اولتی: چھپّر یا کھپریل کا نچلا کنارا جہاں سے بارش کا پانی نیچے گرتا رہتا ہے ۔